بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیمِ

Be faithful even to the point of death, and I will give you the crown of life.
(Rev.2:10)

The Servant of Truth

The Life of Late Dr. Maher Khan

By His Son

Jeremiah Khan

Written by Rev. Asghar Fazal Elahi Paul

"جان دینے تک بھی وفادار رہ تو میں تجھے زندگی کا تاج دوں گا۔"

(انجیل شریف، کتابِ مکاشفہ ۲، آیت ۱۰)

خادمِ حق

آنجہانی ڈاکٹر مہر خان کی کہانی

ان کے فرزند ارجمند

یرمیاہ خان کی زبانی

تحریر

(عالیجناب پادری اصغر فضل الہیٰ پال صاحب)

1966

تمہید

زندگی میں بعض ایسے واقعات پیش آتے ہیں کہ انسان انہیں بھول نہیں سکتا۔ یہ حفاظے پر کچھ اس طرح نقش ہوجاتے ہیں کہ کسی عنوان مٹنے نہیں پاتے۔ بعینہ میں اپنے والد بزرگوار آنجہانی ڈاکٹر مہر خان کی شہادت کے واقعات کو سالہسال اپنے سینہ میں چھپائے پھرتا رہا جنہیں جلد از جلد منظر عام پر لانے کے لئے میری ایک دیرینہ تمنا تھی۔

کتابہ " خادمِ حق " پہلی بار ستمبر ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔ اس میں میرے والد بزرگوار کے مختصر سوانح حیات اور شہادت کے واقعات پادری اصغر فضل الہیٰ پال صاحب نے نہایت دل کش انداز میں تدوین و تصنیف کئے ہیں۔ جب یہ بھولی بسری سچی کہانی نصف صدی گزر جانے کے بعد چھپ گئی ، تو میری خوشی کی انتہا نہ تھی۔ میں اس کارِ خیر کے لئے پادری صاحب کا تہ دل سے مشکور و ممنون ہوں۔

میں چرچ مشنری سوسائٹی لندن کا بھی احسان مند ہوں کہ انہوں نے میری درخواست پر اپنے پرانے ریکارڈ کی جانچ پڑتال کرکے میرے والد بزرگوار کی شہادت کے متعلق چند اہم کاغذات کی نقول مجھے بھیج دیں۔ کتابچہ ہذا کی تصنیف وتالیف کے لئے یہ سب کاغذات اور چرچ مشنری سوسائٹی کی افغان مشن ، بنوں (صوبہ سرحد) کی چھپی ہوئی رپورٹ ۱۹۱۲ء - ۱۹۱۶ء) جو مجھے اتفاقاً چند سال ہوئے دستیاب ہوئی تھی۔ نہایت ہی سود مند ثابت ہوئے۔

اس کتابچہ کی طبع دوم اپریل ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی جس میں پیشتر واقعات کی تفصیل کے علاوہ کئی اور واقعات بھی قلمبند کردیئے گئے جو میرے چند احباب واقارب نے ، خاص کر پادری سمسون خان نیازی (راولپنڈی) اور ڈاکٹر محمد رمضان (ٹل) نے میرے والد بزرگوار کے بارے میں فراہم کئے تھے۔ اس کی پہلی اور دوسری اشاعت کی قریباً سب کتب مخصوص مسیحی شرفا میں مفت تقسیم کردی گئی ہیں۔ خدائے ذوالجلال کا شکر ہے کہ ان کتابچوں کو مسیحی طبقہ میں توقع سے کہیں زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ صوبہ سرحد کے مسیحی افراد خصوصاً ان سے بے حد متاثر ہوئے ہیں۔ کوہاٹ کی انگلیکن کلیسیا نے مرحوم کی پنجاہ سالہ یادگار منانے کے لئے کوہاٹ میں ایک خاص عبادت کا اہتمام کیا اور سینٹ اگستن کے گرجا گھر میں سنگ مرمر کی ایک تختی اس کی دائمی یاد میں نصب کی جس کی رسم نقاب کشائی لاہور کے سابق بشپ تقدس مآب ایل ایچ ولمر صاحب نے ۳ نومبر ۱۹۶۷ء کو ادا کی ۔ اس عبادت میں مختلف کلیسیاؤں کے نمائندوں نے مرحوم کو شاندار خراجِ عقیدت پیش کیا۔

کوہاٹ کی " کیتھولک فرینڈز کلب" کے مسیحی نوجوانوں اور بچوں نے مرحوم کی زندگی اور شہادت کے واقعات پر ایک ڈرامہ تیار کیا جس کا مسودہ کوہاٹ کے ایک مسیحی نوجوان ، یونس سرحدی نے تیار کیا تھا۔ اسے کیتھولک گرجا گھر کے خوبصورت سبزہ زار میں سٹیج پر دو دن متواتر ۳، ۲ نومبر ۱۹۶۷ء کو بڑی کامیابی سے پیش کیا جاتا رہا۔

یہ ڈرامہ بشپ ولمر، اور ان کی اہلیہ اور ہزاروں مسیحی اور غیر مسیحی مردوں، عورتوں اور بچوں نے بڑے شوق سے دیکھا۔ تمام واقعات شروع سے آخر تک تصنع سے پاک اور پر کشش انداز میں پیش کئے گئے۔

میں نے متعدد افراد کو خاص کر مستورات کو، آہیں بھرتے اور اشکبار دیکھا۔

میں پہلی بار نومبر ۱۹۶۷ء میں "ٹل" شہر بھی گیا۔ سرحد کے بیشتر مسیحی گھروں اور حلقوں میں ڈاکٹر مہر خان شہید کو ابھی بڑی عزت اور توقیر سے یاد کیا جاتا ہے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ لارڈرابرٹس ہسپتال جسے ڈاکٹر پینل صاحب نے بڑے جذبے اور محنت سے سن ۱۹۰۹ء میں قائم کیا تھا اور جس میں میرے والد بزرگوار ملازمت کے دوران شہید ہوئے تھے۔ اب وہاں اس کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔

جب تک انگریز مشنری خاتون (مس ڈیوڈسن) ٹل میں سکونت پذیر تھیں اس جگہ پر کچھ مسیحی بشارت کا کام ہوتا تھا۔ ان کے جانے کے بعد کسی نے یہ جگہ خرید لی اور اب وہاں

سکونتی مکانات ہیں، سرائے ہے اور بعض عمارتیں کرایہ پر ہیں۔ وہاں کے معروف ڈاکٹر محمد رمضان صاحب نے مجھے وہ سب جگہیں دکھائیں جن کا تعلق اس خونی ڈرامہ سے تھا۔ فوجی گورا قبرستان جہاں میرے والد بزرگوار مدفون ہیں محفوظ ہے اور قبروں کی حالت خاصی اچھی ہے۔ میرے والد بزرگوار ہی ایک واحد غیر فوجی شخص ہیں جن کو اس قبرستان میں دفن کیا گیا ہے۔

مجھے اس فلک بوس پہاڑی اور پر خطر راستہ کی بھی نشاندہی کرائی گئی، جس پر میری والدہ ماجدہ نے زخمی حالت میں اپنے لختِ جگر (جوئیل) کو ڈاکوؤں کے چنگل سے چھڑانے کی خاطر، رات کی تاریکی میں، قریباً دو میل تک ان ظالموں کا تعاقب کیا تھا۔ اس پتھریلے نکیلے اور ناہموار پہاڑی راستہ کو دیکھ کر دل ہل جاتا ہے۔ اس سے کوئی بھی بخوبی اندازہ کرسکتا ہے کہ اس بچاری اور شامت کی ماری ماں نے زخمی حالت اور رات کی تاریکی میں کس مصیبت اور دکھ سے یہ کٹھن راستہ طے کیا ہوگا۔

اس کتابچہ کی طبع سوم جنوری ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی۔ اس خیال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کتابچہ کو مسیحی عوام میں خاص مقبولیت حاصل ہوئی ہے اور اس کی اب بھی بہت مانگ ہے، اسے چوتھی بار شائع کیا جارہا ہے۔ اس کو پہلے ایڈیشنوں سے زیادہ مفید اور موثر بنانے کے لئے میں نے اس میں متعدد تبدیلیاں کردی ہیں اور چند واقعات زیادہ تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔

جو کام تیرا ہاتھ کرنے پائے اسے مقدور بھر کر۔

(واعظ ۹، آیت ۱۰)

لاہور

ستمبر ۱۹۷۸ء

خاکسار

یرمیاہ خان

پیش لفظ

اے خادمِ حق! ناز ابھی تیرے لئے ہیں
فطرت کے سب انداز بھی تیرے لئے ہیں

اس کتاب میں ڈاکٹر مہر خان شہید کی حسین زندگی، مخلص کردار جان توڑ خدمت، گواہی اور حق کے لئے شہادت کی چند جھلکیاں پیش کی گئی ہیں۔ وہ نہ صرف مرد مومن تھے بلکہ وہ ایک خادم بھی تھے، اور دل وجان سے اپنے آقا ربنا المسیح سے محبت کرتے اور اسی کے خون آلودہ قدموں کے نقوش پر چلتے تھے۔ جب تک ان کی جان میں جان رہی۔ انہوں نے اپنے نجات دہندہ کی مرضی کو پورا کرنے کی غرض سے مشکل سے مشکل خدمات کو سر انجام دیا۔ آخر کار اس سچے، مرد مجاہد، نے اپنے مبارک آقا سیدنا مسیح کی خدمت اور گواہی کے لئے اپنی جان بھی نثار کردی اور شہید ہوئے۔ ان کا نصب العین بہت بلند تھا تاہم ان کے قدم متزلزل نہ ہوئے۔ انہوں نے مرتے دم تک اپنی ذمہ داری کو وفا شعاری سے نبھایا اور نہ صرف "زندگی کا تاج" حاصل کیا جو خداوند اپنے محبت کرنے والوں کو عطا کرتا ہے بلکہ حق کے لئے اپنا خون بہا کر تاجِ شہادت بھی پہنا۔

ڈاکٹر مہر خان کے فرزند ارجمند جناب یرمیاہ خان صاحب میرے ایک مخلص دوست ہیں۔ انہوں نے جب مجھے اپنے والد بزرگوار کی زندگی، خدمت اور شہادت کے واقعات سنائے تو ان سے میرے ایمان کو بڑی تقویت ملی۔ انہوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اگر ان کے والد کی زندگی کے یہ حقائق کتابی صورت میں چھپ جائیں تو انہیں باطنی خوشی حاصل ہوگی۔ چنانچہ میں نے یرمیاہ خان صاب سے ان کے والد بزرگوار کی زندگی کے تفصیلی کوائف اور مفصل تحریری مواد حاصل کیا اور ان کو پڑھنے کے بعد ڈاکٹر صاحب موصوف کی نیک زندگی، قابل رشک خدمت اور حق کے لئے شہادت کے واقعات کو تفصیل وار قلمبند کیا تاکہ ان کو پڑھ کر نہ

صرف کلیسیائے پاکستان جو آج ایک نہایت نازک مرحلہ سے گزر رہی ہے بلکہ کلیسیائے جامع بھی مستفید ہو اور شرکائے کلیسیا میں حق کا احترام، خدمتِ خلق کا جذبہ اور شہادت کا ایک نیا ولولہ پیدا ہو اور وہ اپنی نیک خدمت اور ایمان کی گواہی سے ربنا المسیح کا جلال ظاہر کریں۔

ڈاکٹر مہر خان شہید مسیحی ایمان کے ایک مستحکم نورانی مینار تھے۔ ان کی مسیحی زندگی سے لاتعداد لوگوں نے نجات کی خوشی حاصل کی۔

کتاب مقدس میں مرقوم ہے:

" یسوع (عیسیٰ مسیح) نے جواب میں اس سے کہا جو کوئی اس پانی میں سے پیتا ہے وہ پھر پیاسا ہوگا۔ مگر جو کوئی اس پانی میں سے پیئے گا جو میں اسے دوں گا وہ ابد تک پیاسا نہ ہوگا بلکہ جو پانی میں اسے دوں گا وہ اس میں ایک چشمہ بن جائے گا جو ہمیشہ کی زندگی کے لئے جاری رہے گا۔"

(انجیل شریف بہ مطابق حضرت یوحنا ۴، آیت ۱۳ تا ۱۴)۔

احقر الناس:

(پادری) اصغر الہیٰ پال

لاہور ۱۸ اگست ۱۹۶۶ء

نورانی کرنیں

سیدنا مسیح نے اپنی حین حیات میں اپنے بارہ (۱۲) شاگردوں کو حکم دے کر کہا تھا کہ " چلتے چلتے یہ منادی کرنا کہ آسمان کی بادشاہی نزدیک آگئی ہے۔ بیماروں کو اچھا کرنا۔ مردوں کو جلانا۔ کوڑھیوں کو پاک صاف کرنا۔ بدروحوں کو نکالنا۔ تم نے مفت پایا مفت دینا۔ نہ سونا! اپنے کمر بند میں رکھنا نہ چاندی نہ پیسے۔ راستہ کے لئے نہ جھولی لینا نہ دو دو کرتے نہ جوتیاں نہ لاٹھی کیونکہ مزدور اپنی خوراک کا حقدار ہے۔" (انجیل شریف بہ مطابق حضرت متی ۱۰، آیت ۷ تا ۱۰)

پھر صلیبی موت مرنے اور مردوں میں سے جی اٹھنے کے بعد جب وہ گیارہ شاگردوں کو دکھائی دیا تو اس نے ان سے کہا کہ " تم تمام دنیا میں جا کر ساری خلق کے سامنے انجیل کی منادی کرو۔ جو ایمان لائے اور بپتسمہ لے وہ نجات پائے گا اور جو ایمان نہ لائے وہ مجرم ٹھہرایا جائے گا۔ اور ایمان لانے والوں کے درمیان یہ معجزے ہوں گے۔ وہ میرے نام سے بدروحوں کو نکالیں گے۔ نئی نئی زبانیں بولیں گے۔ سانپوں کو اٹھالیں گے اور اگر کوئی ہلاک کرنے والی چیز پئیں گے تو انہیں کچھ ضرر نہ پہنچے گا۔ وہ بیماروں پر ہاتھ رکھیں گے تو اچھے ہو جائیں گے" (انجیل شریف بہ مطابق حضرت مرقس ۱۶، آیت ۱۵ تا ۱۸)۔

چنانچہ شاگردوں نے پوری فرمانبرداری اور بڑے ذوق و شوق سے ان حکموں کی تعمیل کی اور یوں مسیحیت کی نورانی کرنوں نے پہلے مغرب اور پھر مشرق کو منور کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف افراد اور جماعتوں نے مسیحیت کی نورانی کرنوں سے منور ہو کر اپنی اپنی تجدید شروع کر دی۔ اٹھارھویں صدی کے اختتام پر ڈاکٹر کیری، وارڈ، مارشمین جیسی عظیم المرتبت ہستیوں نے مسیحیت کی قدرت کے وسیلے اس برِ عظیم کے باشندوں میں ایک نئی بیداری، ایک نئی زندگی اور ایک نیا جذبہ پیدا کیا۔

سابق صوبہ شمال مغربی سرحد میں بشارت کا یہ کام ڈاکٹر پینل اور ان کے پٹھان ہم خدمتوں نے سر انجام دیا۔ انہوں نے خدمت خلق اور حق کی شہادت سے خدا کی بادشاہی کو خوب وسعت دی۔ ان میں ڈاکٹر مہر خان کی خدمت اور ان کے ایمان کی گواہی قابل ذکر ہیں۔

خاندانی جھگڑے

پٹھانوں کے ہاں عزت اور شرمندگی کے دو الفاظ پائے جاتے ہیں جو ان کے کردار کی ترجمانی کرتے ہیں۔ یہ دونوں الفاظ مثبت اور نفی کی صورت میں ان کے وقار کو واضح کرتے ہیں، لیکن ان الفاظ کے اصل مفہوم کو سمجھنا اور اس کو بیان کرنا کسی قدر محال ہے۔ بعض حالات میں کوئی شخص اپنی عزت کے تحفظ کے لئے بدترین کام کرنے کے لئے بھی تیار ہوجاتا ہے۔ بعض اوقات جب اسے کسی دعوت میں شرکت کے لئے مدعو کیا جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ اس کے دشمن کے مقابلہ میں مساوی سلوک نہیں کیا جاتا تو ایسے غیر مساوی برتاؤ سے اس کا شیشہ دل پاش پاش ہوجاتا ہے اور وہ اس کو اپنی ہتکِ عزت سمجھنے لگ جاتا ہے۔ وہ حددرجہ غیور، جنگجو اور تلوار کا دھنی ہے۔ ان میں خون کا بدلہ خون، کے رواج نے بہت سے خاندانوں کو تباہ کردیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض خاندان اس اصول کی زد میں آکر صفحہ ہستی سے بالکل مٹ چکے ہیں۔ بدلہ لینے کی یہ روح بعض اوقات طبقہ نسواں میں بھی نظر آتی ہے۔ اس نوعیت کا ایک واقعہ یہاں قابل ذکر ہے کہ ۱۹۰۵ء میں بنوں شہر میں ایک شخص کو کسی متنازعہ زمین کے سلسلے میں بڑی بے دردی سے قتل کردیا گیا۔ وہاں کے لوگ قاتل کو جانتے تھے لیکن چونکہ وہ اور اس کے رشتہ دار بڑے زبردست اور ذی اثر تھے اور اس کے برعکس مقتول کے قریبی رشتہ داروں میں ماسوائے ایک بہن کے اور کوئی نہ تھا اس لئے کوئی بھی شخص مذکورہ قاتل کے خلاف شہادت دے کر اپنی جان جوکھوں میں ڈالنے کے لئے تیار نہ تھا۔ چنانچہ جب یہ مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو جج نے عدمِ شہادت کی بنا پر ملزم کو بری کردیا۔

اس پر مقتول کی بہن نے عدالت کے فیصلہ پر بڑی گریہ وزاری کی اور عدالت سے باہر نکلتے ہوئے جج صاحب کو کہا کہ وہ اب اس معاملہ کو خود ہی حل کرلے گی۔ اپنے بھائی کے قتل نے اس کی آتشِ انتقام کو بھڑکا دیا تھا۔

اس نے مصمم ارادہ کرلیا کہ جب تک وہ اپنے پیارے بھائی کے خون کا بدلہ نہ لے گی چین سے نہ بیٹھے گی۔

ایک صبح جمعہ کے روز جبکہ حسبِ معمول ہفتہ اور میلے میں باہر پہاڑی علاقوں سے ہزاروں پٹھان خرید و فروخت کے لئے بنوں شہر میں آئے ہوئے تھے تو اچانک گولی کا ایک تڑاخا ہوا اور ہجوم میں کھلبلی پڑ گئی ۔ایک وزیری قبائلی خون میں لت پت سڑک پر گرا پڑا نظر آیا۔ پستول کی گولی اس کے دل کے آر پار ہو گئی تھی۔ یہ وہی قاتل تھا جو قانون کی گرفت سے تو بچ نکلا تھا لیکن بدلہ لینے والے کے ہاتھ سے نہ بچ سکا۔ مقتول کی بہن نے اپنے پھٹے پرانے کپڑوں میں ریوالور چھپا رکھا تھا۔ اس نے لوگوں کے ہجوم میں موقع پا کر اپنے عزیز بھائی کے قاتل پر گولی چلا کر اس کا کام تمام کر دیا۔ جب اس لڑکی کو گرفتار کرلیا گیا اور عدالت نے اسے عمر قید کی سزا سنائی تو اس نے کہا

" میں نے اپنے بھائی کا بدلہ لے لیا ہے۔ باقی اللہ کی رضا ہے۔
اب میں بالکل مطمئن ہوں۔"

خون کا بدلہ خون کے رواج سے نہ صرف ایک قبیلہ دوسرے قبیلے سے برسرپیکار رہتا ہے بلکہ ایک ہی قبیلے کے افراد بھی باہمی ناراضگی کی بنا پر ایک دوسرے کے خلاف ہوجاتے ہیں۔

محمد عبداللہ خان

ہم نے مسیح کو روح وجان
دل سے دیا جو ہو سو ہو

محمد عبداللہ ، شیخ محمود والہ نیازی قبیلے کے ایک متمول زمیندار پٹھان تھے۔وہ ایک وسیع رقبہ اراضی کے مالک تھے۔ یہ بڑا گاؤں ہے جو دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر تحصیل عیسےٰ خیل (ضلع میانوالی) سے قریباً چار میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ محمد عبداللہ خان کا گھرانہ عیسےٰ خیل کے ممتاز اور خوشحال گھرانوں میں شمار ہوتا تھا۔ گو وہ اپنے بال بچوں کے ساتھ خوش حال اور پرمسرت زندگی بسر کررہے تھے پھر بھی وہ اپنے قبیلے کی آئے دن کی ماردھاڑ، آپس میں دشمنی اور انتقام کے جذبے سے بے حد متنفر ہوچکے تھے۔ ان سے چھٹکارا کی خاطر وہ اکثر مناسب موقع کی تلاش میں رہتے تھے۔ وہ محبت ، صلح اور باہمی یگانگت کے متمنی تھے۔ چنانچہ جب مسیحیت کی نورانی کرنوں نے ان کے خانہ دل کو منور کیا اور تو وہ انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں اپنے اہل وعیال سمیت کھلم کھلا مشرف بہ مسیحیت ہوگئے۔ اصطباغ پانے کے بعد ان کا نام عبدالمسیح رکھا گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ ان کی دنیائے دل کی کایا پلٹ گئی ، وہ اپنی صلیب اٹھائے اپنے منجی سیدنا مسیح کے سچے پیرو ہوگئے اور اسی کی راہنمائی میں ان کے خاندان کے ہر ایک فرد نے صدق دل سے سیدنا مسیح کو اپنا نجات دہندہ تسلیم کرلیا۔ انہوں نے عہد کیا کہ آئندہ وہ مسیحیت کی سربلندی کے لئے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہ کریں گے۔ ان دنوں مسیحیت قبول کرلینا کوئی خالہ جی کا گھر نہ تھا بلکہ بڑے دل گردے کا کام تھا۔ ان کے گاؤں کے لوگوں نے اس بات کو بہت بُرا منایا کیونکہ یہ پہلا واقعہ تھا کہ ایک پورے مسلم خاندان نے اپنے آبائی دین سے منحرف ہو کر مسیحی دین کو قبول کرلیا تھا۔چنانچہ ان کے مخالفین کے سینے میں جذبہ انتقام انگڑائیاں لینے لگا اور انہوں نے باہمی صلاح مشورہ کے

بعد فیصلہ کیا کہ انہیں اس ہیجان خیز فعل کا مزہ چکھانا چاہیے اور فوری طور پر ان کا حقہ پانی بند کردیا۔ بعد ازاں انہوں نے ان کی زمین کا ایک بہت بڑا رقبہ ان سے چھین لیا اور انہیں وقتاً فوقتاً طرح طرح کی ذہنی اور جسمانی اذیتوں کا نشانہ بنایا۔ انہوں نے اتنے پر بھی اکتفا نہ کیا بلکہ ان کے گھر کو نذر آتش کرکے خاکستر کردیا جس سے ان کو بھاری مالی نقصان پہنچا۔ بڑی مشکل سے انہوں نے اپنی اور اپنے خاندان کے افراد کی جانیں بچائیں۔ مخالفوں نے گاؤں کے سرکاری اہلکاروں کے گٹھ جوڑ سے ان کا نام گاؤں کے رجسٹروں سے مٹا کر یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ کبھی بھی اس گاؤں کے باشندے نہ تھے اور وہاں کی اراضی پر قابض ہونے کے حق دار نہیں انہوں نے عدالت میں حلفیہ بیان دیا کہ وہ دروغی عدالت کے روبرو افشاں ہوگئی اور عدالت نے محمد عبداللہ خان عرف عبدالمسیح کو ان کی بیشتر زرعی زمین واپس دلوادی اور پرانے گھر کے بدلے ایک نیا گھر بنوادیا۔ اگرچہ حالات ایک عرصہ تک سخت دل شکن اور روح فرسا تھے اور خود ان پر اور گھر بار پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹے تو بھی انہوں نے سیدنا مسیح کی محبت سے کامل اطمینان حاصل کیا اور آج کی مالیت کے اعتبار سے لاکھوں نہیں تو ہزاروں کی جائیداد کا نقصان خندہ پیشانی کے ساتھ گوارا کیا۔ وہ دن بدن منزل مراد کی طرف ترقی کرتے چلے گئے ۔ دراصل نجات کے یقین نے ان کو پورا اطمینان قلب دے رکھا تھا جو ایک ایسا سرمایہ تھا جس کے مقابلے میں دنیا کی تمام دولتیں ہیچ تھیں۔وہ تادم زیست سیدنا مسیح کے سچے پیرو بنے رہے۔

رفتہ رفتہ ان کے گاؤں کا ماحول درجہ بدرجہ سازگار ہوتا گیا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ صوبہ سرحد کے شہر بنوں کے مشن ہسپتال کے مشہور ومعروف میڈیکل سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر پینل، عبدالمسیح کے خاندان کی فلاح وبہبود میں کافی دلچسپی لیتے تھے۔ وہ گاہے گاہے شیخ محمود والہ میں آتے جاتے رہتے تھے۔ جونہی لوگوں کو ان کی آمد کی خبر ہوتی وہ جوق درجوق ان سے علاج کرانے یا طبی مشورہ کے لئے آتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد ڈاکٹر پینل کی وساطت سے بنوں میڈیکل مشن نے ۱۸۹۵ء میں اسی گاؤں میں اپنی پہلی برانچ ڈسپنسری کھول دی۔ اس کے پہلے ڈاکٹر انچارج عبدالمسیح کے سب سے چھوٹے بیٹے ڈاکٹر فضل خان تھے جنہوں نے طبی تعلیم وتربیت مشن ہسپتال بنوں سے حاصل کی تھی۔ اس ڈسپنسری کے ذریعہ عبدالمسیح کے خاندان کی گاؤں کے لوگوں میں خاصی ساکھ بن گئی۔ مریض علاج کے لئے آتے تھے اور شفا پاتے تھے۔ یرمیاہ خان کا کہنا ہے کہ اکثر جب لوگ علاج کے لئے آتے تھے تو وہ سوکھی دوائی بغیر پانی ملائے مانگتے تھے چونکہ وہ ایک مسیحی کے گھر کے پانی سے چھوت کرتے تھے۔ بعد میں وہ اپنے گھر جا کر دوائی میں مناسب مقدار میں پانی ملا کر دوائی پیتے تھے۔ جہاں تک ممکن تھا انہیں سوکھی دوائی ہی دی جاتی تھی اور اس کے کھانے یا پینے کی ترکیب مریض کو بتادی جاتی تھی۔

۱۹۰۸ء میں ہندوستان سے انگلستان جانے سے پیشتر ڈاکٹر پینل صاحب اس ڈسپنسری کے کام کا جائزہ لینے کے لئے شیخ محمود والہ کا دورہ کیا۔ ان دنوں ایک عام رسم کے مطابق کسی کی خاص مہم کامیابی کے لئے یا جب کبھی کوئی شخص کسی دور دراز سفر پر جارہا ہوتا تھا تو غریبوں کو کھانا کھلایا جاتا تھا تاکہ ان کی دعائیں اس کے ساتھ ہوں اور اس کے لئے باعث برکت ہوں۔ چونکہ ڈاکٹر پینل صاحب ہندوستان سے باہر ایک لمبے سفر پر جارہے تھے ڈاکٹر فضل خان نے ان کے لئے رسماً دو سو غریب وغربا کو کھانا کھلانے کا اہتمام کیا۔ جب سب کھانا کھاچکے تو ڈاکٹر فضل خان نے ڈاکٹر پینل صاحب کا یہ سفر مبارک کرنے اور راستہ میں ہر خطرے میں ان کی حفاظت کرنے اور صحیح سلامت منزل مقصود تک پہنچانے کے لئے دعا کی۔ دعا کے دوران بنوں مشن ہسپتال اور برانچ ڈسپنسری شیخ محمود والہ میں جو طبی کام ہوتا تھا اس کے لئے خدا کا شکریہ ادا کیا اور وہ سب جوان خیراتی اداروں میں کام کرتے تھے خداوند سے ان کے برکت چاہی ہر ایک دعا کے بعد سامعین " اللہ " کا نعرہ لگاتے تھے جو ان کے طریق میں " آمین" کا ہم معنی تھا۔ ان میں بیشتر افراد ان لوگوں کی اولاد تھی جو کبھی اس ڈاکٹر کے والد بزرگوار عبدالمسیح کے جانی دشمن تھے ، ان کے گھر کو نذر آتش کردیا تھا اور انہیں ملک بدر کرنے کے لئے کوشاں تھے، لیکن اب وہی لوگ عبدالمسیح کے بیٹوں کے ساتھ مل کر شیروشکر تھے۔ ڈاکٹر پینل صاحب ان لوگوں کے رویہ میں خوشگوار تبدیلی دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔

اس کی خاص وجہ عبدالمسیح کے خاندان کی مسیحی زندگی تھی۔ انہوں نے خلوص، دیانتداری، محبت اور برادرانہ الفت سے ان کے دلوں کو موم کرلیا تھا اور وہ جلد ان کے ساتھ گھل مل کر رہنے لگے تھے۔

عبدالمسیح " سرگی"

اس زمانہ میں عیسےٰ خیل، ضلع بنوں کی تحصیل تھی۔ اور سرجان نکلسن اس کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ بعد میں لارڈ کیسنگ کے زمانہ میں جو کہ برصغیر میں برطانیہ کے گورنر جنرل تھے، پشاور میں ان کو ریزیڈنٹ جنرل سرجان نکلسن تھے۔ انہوں نے وفادار سرحدی اور عیسےٰ خیل کے مسلمانوں کا ایک جتھا بنا کر دہلی پر چڑھائی کی اور اسے فتح ہوئی لیکن وہ خود مخالفین میں سے ایک کی گولی کے شکار ہوگئے۔ محمد عبداللہ خان عرف عبدالمسیح جو اس جتھے میں سرجان نکلسن کے باڈی گارڈ میں رسالدار میجر تھے وہ بھی شدید زخمی ہوئے۔ پھر بھی وہ اپنے سالار کی جان بچانے کی خاطر ہر چند کوشش کرتے رہے۔ سرجان نکلسن نے مرتے وقت ایک کاغذ کا پرزہ محمد عبداللہ خان عرف عبدالمسیح کو دیا جس میں ان کی وفادارانہ خدمات کے تعزیتی کلمات میں مندرج تھے۔ یہ لکھت کچھ عرصہ بسیم محمد عبداللہ خان عرف عبدالمسیح کے پاس محفوظ رہی لیکن بعد میں دوسرے سامان کے ساتھ راکھ ہوگئی۔ جب ان کے لواحقین نے ان کے گھر کو نذر آتش کردیا تھا۔ ان کی شان دار خدمات کے صلے میں حکومت نے ایک سرکاری نہر کو جو کہ عیسےٰ خیل کے طور وعرض میں بہتی ہے اس کے نام " عبدالمسیح سرگی" سے موسوم کی ہے۔ یہ نہر اب بھی اس خاندان کی ملکیت ہے۔ جب بھی اس خاندان کے افراد اپنے آبائی شہر میں جاتے ہیں تو وہ ضرور اس مسیحی نام کی سرگی پر جا کر اس کا بہتا ہوا صاف وشفاف پانی پیتے ہیں جس سے ان کو ایک انوکھی قلبی مسرت حاصل ہوتی ہے اور اس عظیم نام "عبدالمسیح" سے ان کی آنکھوں سے احساس فخر صاف صاف جھلکنے لگتا ہے۔ لیکن حیف صد حیف کہ گردش زمانہ کی وجہ سے اس وقت کوئی مسیحی خاندان اس علاقہ میں مستقل طور پر آباد نہیں ہے تاہم ربنا المسیح کا پیارا نام " عبدالمسیح" سے ہمیشہ روشن اور قائم ہے۔

رہے گاہ ناں سدا تیکر مسیح دا
رہے گا جد تلک سورج رہے گا

(زبور ۷۲، آیت ۱۷)

مہر خان

یسوع کے سپاہی۔ جنگ میں قدم مار
کہ صلیب ہے آگے۔ تو نہ ہمت ہار

محمد عبداللہ خان عرف عبدالمسیح کے تین بیٹے تھے جن میں مہر خان ان کے منجھلے بیٹے تھے۔ ان کا بچپن دلچسپ اور پرسکون فضا میں گزرا تھا۔ وہ لمبے قدر اور گورے رنگ کے ایک وجیہہ وشکیل جوان تھے اور سادہ لباس زیب تن کرنے کے دلداہ تھے۔ وہ بارڈر پولیس میں سب انسپکٹر تھے اور اپنے فرائض بڑی تندہی اور خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے اور لوگوں سے بڑے حسن سلوک اور رواداری سے پیش آتے۔ وہ بڑے سنجیدہ معاملہ فہم اور ناقابل تسخیر قوت ارادی کے مالک تھے۔ ان کی پروقار شخصیت سے جلال ٹپکتا تھا۔ زندگی کے بے شمار تلخ تجربوں نے انہیں صابر، ہمدرد اور رحم دل بنادیا تھا۔ اپنے ماتحتوں میں وہ ہر دلعزیز تھے اور ان کے دکھ سکھ میں برابر کے شریک ہوتے تھے۔ وہ ہر مشکل میں ان کا ساتھ دیتے تھے۔

اپنے حلقہ میں وہ بڑے مدُبر گنے جاتے تھے اور اپنے گاؤں میں ان کی بڑی ساکھ تھی۔ عوام اکثر مشورہ کرنے کے لئے اپنے گھریلو معاملات اور دیگر مسائل کے حل کرنے کے لئے ان کے پاس آتے تھے۔ وہ گھوڑے کی سواری کے ماہر بلکہ شہسوار تھے۔ وہ گھوڑا دوڑا کر میخ اکھاڑنے کے کرتب میں بلا کے مشتاق تھے۔ ایک روز وہ اس کھیل کے بعد گھوڑے پر سوار ہو کر گھر کی طرف آرہے تھے تو پیچھے سے ان کا لڑکا یرمیاہ خان اپنے ابا جان کو ملنے کی خاطر دوڑتا ہوا ان کی

طرف بڑھا کہ اچانک ان کے نیزہ کی نوک یرمیاہ خان کی پیشانی پر لگ گئی جس سے بہت خون نکلا اور زخم ہو گیا۔ یرمیاہ خان کے ماتھے پر آج تک اس زخم کا داغ موجود ہے۔

مہر خان کو دورانِ ملازمت اکثر واقات چوروں اور ڈاکوؤں کا تعاقب کرنا پڑتا تھا۔ کوی بارہ وہ عرصہ دراز تک گھر سے باہر بھی رہتے تھے۔ اگرچہ اس ملازمت میں بڑی عزت اور شان تھی پھر بھی وہ اس سے کسی حد تک ناخوش تھے کیونکہ اس سے انہیں سکون قلب حاصل نہیں تھا۔ ان کی زوجہ بھی ایک سادہ لوح دیہاتی عورت تھیں۔ وہ اپنے خاوند کی غیر حاضری میں بے حد متفکر رہتی تھیں۔ جب کبھی وہ آسمان کے مغربی گوشہ میں شفق کی لالی دیکھتیں تو وہ یہ سمجھتی تھیں کہ یہ پولیس کے عملہ اور ڈاکوؤں کی جھڑپ میں خونریزی ہورہی ہے اس کا عکس ہے۔ وہ باری تعالیٰ سے اپنے خاوند اور پولیس پارٹی کی خیر سےواپسی کے لئے دعا کرتی تھیں۔

مہر خان کے قلبِ حزیں میں خدمت خلق کا جذبہ موجیں مارہا تھا۔ بعد ازاں انہوں نے پولیس کی شاندار نوکری سے سبکدوش حاصل کرکے چرچ مشن ہسپتال بنوں میں ملازمت لے لی جو ان کی خواہشات کے عین مطابق تھی کیونکہ اس سے انہیں خدمتِ خلق کا بہترین ذریعہ میسر آگیا۔ انہوں نے فوراً اپنے کام میں دلچسپی لینی شروع کردی اور اپنے فرائضِ منصبی کو بہتر سے بہتر سرانجام دینے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ چونکہ وہ بہت ہی سادہ، خندہ، ملنسار اور ہروقت نیکی کرنے کے درپے رہتے تھے۔ انہوں نے تھوڑے عرصہ میں اپنے ملنے جلنے والوں اور ہسپتال کے مریضوں میں بڑی مقبولیت حاصل کرلی۔ وہ سب ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔

ان ایام میں بنوں مشن ہسپتال کے میڈیکل سپر ٹنڈنٹ ڈاکٹر پینل تھے جو طبی علم وفن، مسیحی کردار اور خدمت میں بے حد مشہور ومعروف تھے۔ وہ انگریز تھے لیکن ان کا لباس عموماً دیسی ہوتا تھا یعنی شلوار، قمیض اور پگڑی پہنتے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر پینل کی قربت، فیضانِ صحت اور شفقت مہر خان کے لئے بے حد مفید ثابت ہوئی۔ انہوں نے اپنی کوشش اور محنت سے علم طب اور فن جراحی میں خوب استعداد اور قابلیت پیدا کرلی۔ ساتھ ہی فطری طور پر چونکہ وہ لکھنے پڑھنے اور غور وفکر کرنے کی طرف مائل تھے انہوں اس دورت میں کتابِ مقدس کا بھی گہرا مطالعہ کیا اور یوعلمِ الہیٰ کے دقیق مسائل کی تفہیم حاصل کرلی۔ بعد ازاں وہ فضل الہیٰ سے مسیحی دین کے مختلف موضوعات پر غیر مسیحیوں کے ساتھ بڑے جوش وخروش سے بحث مباحثہ کرتے رہتے تھے اور ان کے اعتراضات کا مناسب جواب دینے کے قابل ہوگئے تھے۔ لوگ اکثر ان کے نقطہ نظر سے قائل ہوجاتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ مسیحی دین کی تجلیات اور اس کی برکات کا انکشاف مولویوں پر بڑے برادرانہ اور بے تکلفانہ انداز میں کرتے تھے۔ وہ ان سے گھنٹوں علمی اور دینی امور پر بحثیں کیا کرتے تھے۔ ان میں ایک دوسرے کے ساتھ بڑے دوستانہ مراسم تھے اور دوستی کے یہ رشتے بڑے مضبوط ہوتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بھائیوں کی طرح رہتے اور خوشی وغم میں شریک ہوتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایسے مباحث میں وہ ایک دوسرے کے نقطہ نظر کا احترام کرتے تھے اور ان کے درمیان نکتہ پردازی کی لت مطلق حائل نہ ہوتی تھی جیسے کہ فی زمانہ میں عام پائی جاتی ہے۔ کیسے شریف النفس لوگ تھے اور کیاپیار، محبت، بے نفسی اور ملنساری کا زمانہ تھا۔ مہر خان میں انجیل کی بشارت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ وہ اس امر کا بہت خواہش مند تھا کہ منجی دو عالم کا نجات بخش پیغام زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچایاجائے۔ وہ متواتر انجیل کی بشارت دیتے رہتے تھے اور خدا کی بادشاہت کی توسیع واشاعت کے لئے شب وروز تندہی اور لگن سے کوشاں رہتے تھے۔

مہر خان نے اپنے وسیع مطالعہ سے پشتو ادبیات پر پورا تسلط حاصل کرلیا تھا۔ انہیں پشتو زبان کی مہارت تامہ تھی اور ان کا نسب ولہجہ بالکل پشتونوں کی طرح تھا۔ جب وہ تقریر کرتے تھے جو مدلل اور پرزور ہوتی تھی تو ان کے منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ مہر خان کے خیالات ونظریات سے اختلاف ممکن تھا مگر یہ ممکن نہیں کہ سامعین ان کی اعلیٰ ظرفی، بلند کرداری اور اخلاقی دلیری کا اعتراف نہ کرلیں۔ ان باتوں میں وہ اپنا جواب آپ تھے۔

جب وہ عوام کے سامنے انجیل مقدس کا پیغام دیتے تھے تو وہ بے حد اثر انداز ہوتا تھا اور متلاشیان حق پروانوں کی طرح ان کے ارد گرد جمع ہوجاتے تھے۔ فی الواقع وہ بڑی خوبیوں

کے مالک تھے۔ کتابِ مقدس کا درس بڑے جوش کے ساتھ دیتے مگر موثر طرز زبان ایسا ہوتا کہ دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا تھا۔

وہ بنوں مشن ہائی اسکول کے معلمین اور بڑی عمر کے طلباء میں بڑے ہر دلعزیز تھے کیونکہ وہ ان سے خاص طور پر بہت شفقت سے پیش آتے تھے اور ان کی تعلیم و تربیت اور کھیلوں کے پروگراموں میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ وہ ان سے کچھ ایسا گھل مل گئے تھے کہ درمیان میں کوئی فاصلہ نہ تھا۔ وہ ان کو پیار سے " چاچا" کے لقب سے پکارا کرتے تھے۔

بازاری منادی

ان ایام میں پاک کلام کی منادی بنوں کے مسیحیوں کی دینی زندگی کا ایک اہم حصہ تھی۔ مقررہ ایام اور اوقات پر، خاص کر جمعہ کے دن وہاں کے بازاروں میں منادی کی جاتی تھی۔ یہ بڑا جان جوکھوں کا کام تھا۔ قدم قدم پر خطرات تھے۔ انہیں بڑے بڑے خطرناک حالات سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ منادی کا افتتاح یوں ہوتا تھا کہ بنوں کے بھرے بازار میں ایک مقررہ مقام پر پہلے چند چھوٹے چھوٹے بچے مسیحی گیت گاتے تھے اور ان کی سریلی آواز اور گیتوں کے دلکش بولوں پر آن کی آن میں غیر مسیحیوں کی بھیڑ لگ جاتی تھی۔ اکثر بنوچی سامعین اس سے بے حد متاثر ہوتے تھے۔ اس کے بعد ڈاکٹر ٹی۔ ایل۔ پینل اور ڈاکٹر مہر خان پشتو زبان میں ایک کثیر التعداد ہجوم سے مخاطب ہو کر پیغام نجات دیتے تھے۔ کبھی کبھار خطبہ کے دوران اِکا دکا شخص مشتعل ہو کر خلل ڈالنے کی کوشش کرتا اور مسیحی جماعت پر روڑے پھینکتا، لیکن خدا کے فضل سے نہ کبھی خطبہ دینے میں کوئی خاص رکاوٹ ہوئی اور نہ ہی کسی کو جسمانی چوٹ آئی۔ کبھی وہ ان پر مذاق اور طنز کے پتھر بھی برساتے تھے۔ ان اجلاس سے خدا نے اپنے بندوں کے وسیلے بہت سے لوگوں تک انجیل کی خوشخبری پہنچائی۔

یہاں یرمیاہ خان کا ایک چشم دید واقعہ قابل ذکر ہے۔ بنوں شہر کے ایک نواحی گاؤں کا ایک کھاتا پیتا زمیندار پٹھان ان اجلاس سے بے حد متاثر ہو کر ڈاکٹر پینل صاحب سے ملا اور اس نے مسیحی دین قبول کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے اس بارے میں ڈاکٹر مہر خان کے سپرد کر دیا تا کہ وہ اندازہ لگائیں کہ وہ حقیقتاً مسیحی ہونے کا خواہش مند ہے یا نہیں۔ مہر خان نے اس کی خوب چھان پھٹک کی۔ انہوں نے اسے اپنے خاندان کے مسیحی ہونے کی ساری رام کہانی سنائی کہ انہیں کن کن مصائب کا سامنا کرنا پڑا اور کس طرح سے ان کا خاصا رقبہ اور اراضی بھی چھین لیا گیا۔ تاہم انہوں نے جو ابدی اطمینان، سکون اور دائمی نور سیدنا مسیح کی محبت سے حاصل کیا۔ انہوں نے ماضی کی سب اذیتوں کو جو انہیں دی گئی تھیں، ہیچ پوچ سمجھا۔ اب تو خداوند کا فضل ہی ان کے لئے کافی تھا۔ چنانچہ سیدنا مسیح کو قبول کرنے سے پیشتر مہر خان نے اسے اس معاملہ پر اچھی طرح سے غور کرنے کی ترغیب دی اور اسے ایک ہفتہ کے بعد پھر آنے کو کہا۔

کچھ دنوں کے بعد وہ مہر خان کے پاس آیا اور بولا کہ اس نے مسیحی دین قبول کرنے کے متعلق سب امور اور نتائج پر خوب سوچ بچار کیا ہے۔ وہ سیدنا مسیح کے لئے سب کچھ قربان کر دیگا اور اس کے نام کی خاطر خوشی سے سخت سے سخت مصیبت اٹھانے کے لئے ہر وقت تیار ہے۔ ساتھ ہی اس نے ایک بڑی رقم بھی مہر خان کے حوالہ کر دی کہ یہ سب اس کی پونجی ہے اور اسے ہسپتال کے خرچ اخراجات کے لئے استعمال کیا جائے۔ اس نے اپنی ساری اراضی اور دیگر اشیا بیچ کر یہ رقم حاصل کی تھی۔

کچھ عرصہ کے بعد اسے بپتسمہ دے کر ہسپتال میں ملازم رکھ لیا گیا۔ ساتھ ہی اس نے بڑی دلچسپی سے کتاب مقدس کا بھی مطالعہ شروع کر دیا۔ ایک دن جب بنوں بازار میں منادی کی جارہی تھی اس کے چند جان پہچان پٹھانوں نے اس اس پارٹی میں شرکت کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ آگ بگولا ہو گئے اور اس پر حملہ کر دیا۔ اسے گھسیٹ کر بری طرح سے زدوکوب کیا اور خنجروں کے وار کر کے اسے ادھموا چھوڑ کر بھاگ اٹھے۔ منادی کی پارٹی نے اسے چھڑانے کی کوشش کی لیکن انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ وہ حیات اور موت کی کش مکش کی حالت میں ہسپتال لایا گیا۔ اس کے جانبر ہونے کی بہت کم امید تھی۔ وہ تقریباً چھ مہینے ہسپتال میں صاحب فراش

رہنے کے بعد صحت یاب ہو گیا جو ایک معجزہ سے کم نہ تھا۔ اب تو اس کو پہچاننا قدر سے مشکل تھا کیونکہ اس کا حلیہ زخموں کے داغوں سے بالکل بگڑ گیا تھا۔ اس تلخ تجربے نے اس پر گہرا اثر کیا اور وہ مسیحی ایمان میں اور بھی زیادہ مضبوط اور مستحکم ہو گیا۔

وہ سیدنا مسیح کا سچا پرستار تھا اور اب وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ صبح کے وقت ہسپتال میں باہر سے آنے والے بیماروں کو مسیحی زندگی اور ایمان پر درس دیا کرے۔ لیکن افسوس ہے کہ ڈاکٹر پینل صاحب کی وفات کے کچھ عرصہ بعد اس کی امیدوں اور آرزوں پر پانی پھیر دیا گیا۔ ہسپتال کی نئی انتظامیہ نے اس کو ملازمت سے سبکدوش کر دیا کیونکہ جس اسامی پر وہ فائز تھا اب اس کی ضرورت نہ رہی تھی۔ انتظامیہ سے اپنی بحالی کے لئے اس کی منت سماجت کار گر نہ ہو سکی۔ ڈاکٹر مہر خان کو اس کی برطرفی کا خصوصاً بہت رنج ہوا اور انہوں نے اس کی بحالی کے لئے حتی الوسع کوشش کی مگر انتظامیہ اپنے فیصلہ پر قائم رہی۔

یوں مسیحیت کا ایک بیش بہا سچا موتی، بے کس اور بے خانماں اپنے کپڑوں کی گٹھڑی بغل دبائے بنوں سے ہجرت کر کے کسی انجان منزل کو روانہ ہو گیا۔ غالباً وہ تحصیل " لکی مروت " چلا گیا جہاں اس کے چند جان پہچان رہتے تھے۔ ڈاکٹر مہر خان اور ان کا لڑکا یرمیاہ خان اس کے ساتھ بہت دور تک گئے۔ الوداع کہتے وقت تینوں کے چہروں پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ اس کے آخری الفاظ کچھ یوں تھے۔ " ڈاکٹر صاحب ! مجھے جس کی تلاش تھی وہ مجھے مل گیا ہے یعنی سیدنا عیسیٰ مسیح۔ اب میں کہیں بھی جا سکتا ہوں اور بخوبی گذر بسر کر سکتا ہوں کیونکہ سیدنا مسیح کی محبت اور شفقت ہمیشہ میرے ساتھ ہیں "

کتابِ مقدس میں مرقوم ہے:

" تو مت ڈر، کیونکہ میں تیرے ساتھ ہوں۔ ہراساں نہ ہو کیونکہ میرا تیرا خدا ہوں۔ میں تجھے زور بخشوں گا۔ میں یقیناً تیری مدد کروں گا اور میں اپنی صداقت کے دہنے ہاتھ سے تجھے سنبھالوں گا۔ " (کتاب مقدس صحیفہ حضرت یسعیاہ ۴۱، آیت ۱۰)۔

دیہاتی بشارت

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ بنوں اور کالا باغ کے درمیان نہ ریل گاڑی تھی اور نہ ہی کوئی خاطر خواہ حمل و نقل کا انتظام تھا بلکہ مسافت پاپیادہ طے کرنی پڑتی تھی۔ سفر کی دشواریاں ایسی تھیں کہ ایک ضلع سے دوسرے ضلع کی حد تک پہنچنے کے لئے ہفتوں کی کٹھن اور دشوار مسافت درکار تھی۔ مہر خان کبھی کبھار مسیحی مبشروں کی ٹولی بنا کر جس کا وہ سرکردہ ہوتا تھا بنوں سے تحصیل " لکی مروت " جن کے درمیان تخمیناً ستائیس ۲۷ میل کا فاصلہ تھا دورہ کرتے تھے۔ اپنا سازو سامان اور دواؤں کا صندوق اونٹ پر رکھ کر یہ ٹولی پیدل اس رتیلہ علاقہ میں انجیلِ جلیل کی بشارت دینے کے علاوہ بیماروں کا علاج معالجہ بھی کرتی تھی۔ ان کے دلکش پیغامات سے بہت سے افراد متاثر ہوتے تھے اور ان میں سے چند نے مسیحیت قبول کی جس میں ایک نام محمد خان تھا۔ وہ پٹھان تھا اور تحصیل " لکی مروت " کے قصبہ " لنڈی واہ " کا باشندہ تھا۔ اس نے اپنی زوجہ سمیت مسیحیت قبول کی۔ ان دونوں نے بشپ لائفرائے (جو کہ بعد میں کلکتہ کے بشپ اور ہندوستان کے بڑے لاٹ پادری تھے) کے ہاتھوں بپتسمہ لیا۔ یہ رسم ڈاکٹر مہر خان کے آبائی گاؤں شیخ محمود والہ میں ادا کی گئی۔ محمد خان اور اس کی بیوی بنوں آ گئے اور دوسرے مسیحیوں کے ساتھ مشن ہسپتال کے احاطہ میں رہنے لگے۔ کچھ عرصے کے بعد انہوں نے مسیحی مذہب کے بارے میں کافی تعلیم حاصل کر لی اور اپنے مسیحی ایمان کی گواہی کے لئے اپنے قصبہ لنڈی واہ کو لوٹ گئے۔ شیخ محمود والہ کے شہریوں کو بپتسمہ کا یہ ماجرا ناگوار گذرا اور انہوں نے انہیں کچھ عرصہ کے بعد مل ملا کر سنگین نوعیت کے الزام میں گرفتار کروا دیا۔ چونکہ وہ اپنی صفائی میں کوئی گواہ اور وکیل پیش نہ کر سکے، عدالت نے انہیں طویل معیاد کے لئے قید بامشقت کی سزا دے دی۔ پولیس پارٹی ان کو ہتھکڑی لگا کر لے گئی۔ وہ ابھی بنوں کے قریبی قصبہ " غوری والہ " میں پہنچی ہی تھی کہ مہر خان اور ان کی ٹولی بشارت کی مہم ختم کر کے " کمر مشافی " سے بنوں واپس آ رہی تھی۔ محمد خان کو پولیس کی حراست میں دیکھ

مہر خان کی نیک بیوی

دوست اور دنیا تم کو چھوڑیں ۔ گر رہے نہ کوئی پاس
یسوع ہی تمہارے دل کو۔ دے گا خوشی بے قیاس

مہر خان نے مسیحی ہوتے ہوئے اپنے گاؤں کی ایک غیر مسیحی خاتون کو اپنی زندگی کا ساتھی بنالیا تھا۔حالانکہ دونوں کے والدین اس رشتہ سے قدرے ناخوش تھے۔ وہ پنج وقت نماز اور روزہ کی بڑی پابند تھیں۔ وہ حیران تھیں کہ ان کے خاوند نماز نہیں پڑھتے بلکہ ان کی عبادت کا طریقہ کچھ عجیب سا تھا جو ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ آخر الامر جب ان کو معلوم ہوگیا کہ وہ مسیحی ہیں تو انہوں نے اپنے کھانے پکانے کا انتظام علیحدہ کرلیا کیونکہ اکثر غیر مسیحی لوگ مسیحیوں کے ساتھ کھانے پینے میں چھوت کرتے تھے۔ تقریباً دو سال تک ایسا ہی ہوتا رہا۔مہر خان بالکل اس معاملہ کے متعلق خاموش رہے اور اپنی نیک زندگی سے مسیح کی قدرت کا مظاہرہ کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ اس نیک خاتون پر مسیحی دین کی تجلیاں آشکارا ہونی شروع ہوگئیں اور وہ مہر خان سے مسیحی تعلیمات اور شعائر کے بارے میں گاہے گاہے استفسار کرنے اور سوال پر سوال پوچھنے لگیں۔ مہر خان ان کے سوالوں کا جواب دیتے رہے جس سے ان کی زوجہ کا سینہ مسیحیت کی روشنی سے منور ہوتا چلا گیا۔ آخر کار مہر خان کی مسیحی زندگی کی تاثیر سے وہ حلقہ بگوش مسیحیت ہوگئیں۔انہوں نے صدق دل سے سیدنا مسیح کو اپنا نجات دہندہ قبول کرلیا جس سے ان کے پورے گھرانے میں تہلکہ مچ گیا۔ گھر کے جس فرد نے سنا ایک بار سناٹے میں آگیا۔ چنانچہ ان کے عزیزو اقارب نے ان سے بالکل کنارہ کشی اختیار کرلی۔ انکے بڑے بھائی نے یہ فیصلہ کیا کہ جب تک وہ زندہ رہے گا اپنی بہن کا منہ نہ دیکھے گا، تاہم ان کے دوسرے بھائیوں نے کچھ عرصہ کے بعد اپنی بہن سے ملنا شروع کردیا۔ وہ ان سے اور ان کے بچوں سے بے حد محبت رکھتے تھے۔

کر حیران ہوگئی ۔ مہر خان کی درخواست پر پولیس افسر نے محمد خان کو مہر خان سے بات چیت کرنے کا اجازت دے دی۔ محمد خان نے مہر خان کو سب ماجرا سنایا اور کہا کہ یہ سب معاملہ ان کے گاؤں والوں کی سازش کا نتیجہ ہے اور وہ بے قصور ہیں۔ مہر خان حق بات کی برملاحمایت کرتے تھے اور کسی کوخاطر میں نہ لاتے تھے۔ بنوں پہنچ کر وہ فوراً ڈاکٹر پینل صاحب کو ملے اور سب قصہ بیان کیا۔ وہ دونوں بنوں کے سیشن جج کو ملے اور ان پر سب حقیقت واضح کردی۔ جج صاحب نے واقعات کی روشنی میں محمد خان کو باعزت رہا کرنے کافوراً حکم دیا اور اس پر عمل درآمد کرنے کے لئے قصبہ " پیزو" کے حکام کو بذریعہ تار مطلع کردیا جو کہ ڈیرہ اسماعیل خان کے قریب ہے۔ جیسے ہی پولیس پارٹی " پیزو" میں وارد ہوئی حکام نے محمد خان کو رہا کردیا۔ بعد میں محمد خان نے اپنے مسیحی کردار اور رویہ سے اپنے گاؤں میں کافی مقبولیت حاصل کرلی اوروہ تادم زیست سیدنا مسیح کے سچے پیرو بنے رہے۔

اسی طرح ضلع کوہاٹ کے علاقہ میں بشارتی ٹولیاں ادویات لے کر دورہ کرتی تھیں جن کے سر کردہ ڈاکٹر پینل یا ڈاکٹر مہر خان ہوتے تھے۔ ٹل شہر میں ایک نالے کے کنارے ڈاکٹر پینل بمعہ ڈاکٹر مہر خان اور اپنے ساتھیوں کے ایک چبوترے پر ڈیرہ کرتے اور پاک کلام کی بشارت کے علاوہ مریضوں کا علاج ومعالجہ بھی بغیر کسی معاوضہ کے کرتے تھے۔ ایک گدھے پر ان کا سازو سامان لدا ہوتا تھا۔ وہ اکثر ان پہاڑوں میں پیدل سفر کرتے تھے۔ یوں خدا کا کلام ترقی کرتا اور پھیلتا گیا۔

مہر خان کی اہلیہ ایک فرشتہ سیرت اور خوش مزاج خاتون تھیں۔ وہ سادہ لباس پہنتیں اورلہجے میں بہت مٹھاس رکھتی تھیں۔ چونکہ مہر خان خدا کی راہوں پرچلتے تھے اس لئے ان کی نیک بیوی خدا کی طرف سے ان کے لئے آسمانی بخشش تھیں۔ دونو میاں بیوی اپنے نیک کردار سے مسیحی دین کی تجلیوں سے غیر مسیحیوں کے دلوں کو برسوں منور کرتے رہے۔

بنوں سے ہجرت

ڈاکٹر مہر خان نے کافی عرصہ تک بنوں مشن ہسپتال میں طبی کام کیا اورپھر کسی خاص نظریئے کے تحت مشن کے کام کو چھوڑ دیا اور بنوں سے ہجرت کرکے اپنے آبائی گاؤں شیخ محمود والہ میں چلے گئے۔ چونکہ وہ جدی زرعی اراضی کے مالک تھے، وہ اپنی کھیتی باڑی میں بڑی محنت اور مشقت کرنے لگے اور ساتھ ہی فالتو وقت میں انہوں نے اپنی طبی پریکٹس بھی جاری رکھی۔ وہ نہایت سخت جان تھے۔ کڑی سے کڑی مشقت برداشت کرسکتے تھے۔ وہ نمود ونمائش اوردولت کی طمع سے بالکل بے نیاز تھے۔ مثلِ مشہور ہے" کھیتی خصم سیتی" اس لئے وہ حسب معمول پو پھٹنے سے چند گھنٹے پہلے اپنی اراضی پو جو کہ گھر سے قریباً دو میل دور تھی جاتے اور اس کی کاشت میں اپنے مزارعین کا ہاتھ بٹاتے۔ کبھی کبھار تو وہ سارا دن تپتی دھوپ میں ہل چلاتے رہتے تھے۔

کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے یرمیاہ خان کو اپنے ایک قریبی رشتہ دار کے ہاں ملتان بھیج دیا۔ اسے وہاں " ابیگیل مشن ہائی اسکول" میں داخل کردیا گیا۔ وہ اس وقت آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔

ٹل ہسپتال کے لئے دعوت

صلیب اپنی اٹھا جو چلیں پیچھے مسیحا کے
مصیبت جھیلتے ہیں جو وہی راحت بھی پاتے ہیں

کچھ عرصہ کے بعد افغان میڈیکل مشن بنوں کو لارڈ رابرٹس مشن ہسپتال ٹل ضلع کوہاٹ کے لئے ڈاکٹر کی ضرورت پڑی۔ یہ ہسپتال سن ۱۹۰۹ء میں قائم کیا گیا تھا۔ اس کا پہلا ڈاکٹر انچارج ڈاکٹر مہر خان کا بھتیجہ ڈاکٹر کرم داد خان ایم۔ بی۔ بی۔ ایس تھا۔ جسے اس ہسپتال کے لئے مخصوص کردیا گیا تھا جبکہ وہ لاہور میڈیکل کالج میں طبی تعلیم حاصل کررہا تھا۔ اس شکیل نوجوان نے تھوڑے عرصہ میں شہریوں اورقبائلیوں میں بڑا نام پیدا کرلیا لیکن بعد میں وہ کسی خاص ذاتی معاملہ کی بنا پر ہسپتال کو خیر باد کہہ گیا۔

اس ہسپتال میں وقتاً فوقتاً متعدد ڈاکٹر کام کرتے رہے۔ انہیں کئی دفعہ ٹل کے خبر رساں ادارے نے ہسپتال پر قبائلی ڈاکوؤں کے حملے اور انہیں اغوا کرنے کے بارے میں خبردار کیا جسکے باعث وہ اکثر ڈر کے مارے رات ٹل کے قلعہ میں گزراتے تھے۔ یہ ڈاکو بڑے ظالم اور ہیبتناک تھے اور وہ سب غارت گری کو آتے تھے۔ سو بیچارے ڈاکٹر ایسی زندگی سے عاجز تھے جہاں شب وروز ایک ہولناک خطرہ ان کے سر پر منڈلاتا رہتا تھا۔ آخر کار وہ ایک ایک کرکے سب چلے گئے۔

ٹل شہر جو کہ افغانستان سے پاکستان کے راستے پر واقع ہے تین اطراف سے خاکی رنگ کی اونچی اونچی پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے جن کی دوسری طرف آزاد قبائلی علاقہ ہے۔ یہ پہاڑیاں بالکل ننگی، ویران اور غیر آباد ہیں۔ ان پر ہریاول کا نام ونشان تک نہیں۔ میدان میں ہر جگہ ریت ہے جو آندھیوں سے ہوا میں اڑتی رہتی ہے۔ گرمیوں میں زمین یوں تپتی ہے گویا دوزخ کی آگ ہے۔ مشن ہسپتال ان پہاڑیوں سے چند سو گز کے فاصلے پر واقع ہے۔ ایک زمانہ

میں یہی شہر برطانوی جنرل سر فریڈرک رابرٹس (جو بعد میں فیلڈ مارشل ہوگئے اور پھر انہیں لارڈ کا خطاب دیا گیا) کا ہیڈ کوارٹر تھا جب وہ افغانستان اور برطانیہ کی جنگ (سن ۸۰-۱۸۷۹ء) اپنی فوجی مہم کے سالار تھے۔ اس آزاد قبائلی علاقہ میں اکثر وہ بد اخلاق افراد رہائش رکھتے تھے جو کہ ٹل اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں قتل وغارت اور لوٹ مار کی وارداتیں کرکے مفرور ہوگئے تھے۔ تقسیم سے پہلے افغانستان سے قافلے اسی راستہ سے ہندوستان آتے جاتے تھے۔ اسی مشن ہسپتال میں ان کا علاج معالجہ کیا جاتا تھا کیونکہ اس شہر میں طبی امداد کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہ تھا۔ ٹل کے باشندے بھی اپنے علاج معالجہ کے لئے اسی ہسپتال میں آتے تھے۔ ہر سال اوسطاً آٹھ ہزار مریضوں کا علاج یہاں کیا جاتا تھا۔ اس ہسپتال کا ہیڈ کوارٹر بنوں میں تھا۔ بنوں سے ٹل جانے کے لئے ریل گاڑی کا سفر ایک سو چالیس میل تھا جو خطرہ سے خالی نہ تھا۔ چھوٹا پہاڑی راستہ وزیرستان سے ہوتا ہوا چونتیس میل تھا لیکن خطرہ کی وجہ سے حکومت نے اسے بند کر رکھا تھا۔ ڈاکٹر مہر خان سے درخواست کی گئی کہ وہ اس ہسپتال کا چارج لے لیں کیونکہ کوئی ڈاکٹر اس پر خطر اور دور افتادہ مقام میں جہاں لوگ ناخواندہ اور تنگ نظر آتے تھے۔ اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر جانے کے لئے رضامند نہ تھا۔ مہر خان بھی اس پر خطر علاقہ سے اچھی طرح سے واقف تھے کیونکہ وہ اکثر بنوں سے بشارتی ٹولیوں کے ساتھ یہاں دورہ کیا کرتے تھے۔ انہوں نے درخواست کو کئی دفعہ غور سے پڑھا۔ انہوں نے آباد گھر چھوڑنا اور ویرانے میں جا بیٹھنا، نئی ذمہ داری کے بوجھ، سخت زندگی کی تکالیف ومصائب اور ایثار اور قربانی کے تمام پہلوؤں پر غور وخوض کیا۔ پہلے تو انہوں نے، دو تین دفعہ اس درخواست کو رد کردیا۔ لیکن بعد ازاں خدمت خلق کے جذبہ سے اس دعوت کو اپنے آقا ومولا کی بلاہٹ قرار دے کر اپنی تمام مجبوریوں کو بالائے طاق رکھا اور خدا پر توکل کرکے مذکورہ ہسپتال کا چارج لینے کے لئے تیار ہوگئے۔ وہ خدمت خلق کو محض ایک اخلاقی وصف نہ سمجھتے تھے بلکہ اپنے آقا ومولا کی عبادت۔ انہوں نے درخواست کو قبول کرتے ہوئے افغان میڈیکل کمشن بنوں کی انتظامیہ کو لکھ بھیجا کہ وہ اس کے لئے بسر وچشم تیار ہیں۔

مقبولیت

چند دنوں کے بعد ڈاکٹر مہر خان اپنی اہلیہ اور دو کمسن بچوں (اشرف خان اور جوئیل) سمیت ٹل پہنچ گئے اور ہسپتال کا چارج لے ان دنوں سارے ٹل شہر میں گنتی کے پانچ یا چھ مسیحی خاندان تھے۔ اکثر شہریوں کا مسیحیوں کے ساتھ سلوک خاطر خواہ نہ تھا اور وہ ان کو اچھوت سمجھتے تھے۔ ان کے ایسے سلوک سے وہ سخت نا امید اور مایوس رہتے تھے۔ ڈاکٹر مہر خان کو قدم قدم پر مشکلات پیش آئیں مگر ان کا عزم پختہ تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں انہوں نے اپنے حسن اخلاق خدمت، محبت پیار کے دو بول، طبی فن، خلوص، مسیحی مزاج، سچائی، قربانی اور نیکی کی وجہ سے عوام وخواص میں بے حد مقبولیت حاصل کرلی۔ وہ بڑے باحوصلہ اور جرات مند تھے۔ انتہائی نازک گھڑیوں میں بھی پر سکون رہتے تھے۔ وہ اس پر خطر علاقہ میں مسلسل صبر و تحمل اور بردباری سے کام کرتے رہے۔ دنیا میں عام طور پر لوگ اپنے ہی ذاتی فائدے کے بارے میں سوچتے ہیں اور اپنے آرام وآسائش اور عزت ودولت کے لئے ہمہ وقت جدوجہد کرتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر مہر خان ان لوگوں میں نظر آئے جو خود بے آرام رہ کر اور تکلیف اٹھا کر دوسروں کے کام آتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو دیکھ کر ہی انسانیت کی قدروں کا انداز ہوتا ہے اور ایسے لوگوں سے دنیا میں دوسروں کے لئے ہمدردی اور قربانی کا جذبہ زندہ ہے۔ خداوند کریم نے ان کے ہاتھ میں ایسی شفا دی تھی کہ ہسپتال میں ہمیشہ بیماروں کو جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ شفا بخشی کی اس تاثیر کی وجہ سے وہ ٹل کے دور دراز گوشوں تک مشہور ہو چکے تھے۔

مہر خان کی ایک عادت

قیام ٹل کے دوران مہر خان کی عادت تھی کہ وہ حسب معمول رات کے وقت ہسپتال میں گشت کیا کرتے تھے۔ گشت کرتے وقت انہوں نے کئی دفعہ چوروں اور ڈاکوؤں کو ہسپتال کی حدود میں پکڑا تھا۔ ایسے لوگوں کو وہ سمجھاتے کہ جب ہسپتال کا عملہ بغیر کسی نفع اور

طمع کے انتہائی خلوص اور سرگرمی کے ساتھ دکھی انسانیت کی خدمت اور بیماروں اور زخمیوں کا علاج کرتے ہیں تو مناسب نہیں کہ وہ اس ہسپتال میں چوری یا ڈاکہ کی نیت سے آئیں۔ وہ ان کی نصیحت آموز باتوں سے متاثر ہوتے اور بغیر چوں وچرا چپ چاپ واپس چلے جاتے تھے۔

چوکیداروں کا معاملہ

اس ہسپتال میں دو پرانے چوکیدار تھے۔ جو کافی ضعیف تھے۔ چونکہ ان کا کام تسلی بخش نہ تھا ان کی برطرفی کا سوال پیدا ہوا۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد ڈاکٹر مہر خان کو ہیڈ کوارٹر سے حکم ملا کہ وہ دونوں چوکیداروں کو برخاست کردیں اوران کی جگہ دو نوجوان چوکیدار رکھ لیں۔اس حکم کی تعمیل میں مہر خان نے پرانے چوکیداروں کو ملازمت سے سبکدوش کردیا اور ان کی جگہ نئے چوکیدار رکھ لئے۔ پرانے چوکیدار اپنے گاؤں کو چلے گئے اور وہاں اپنے قبیلے کے ملک سے شکایت کی کہ ڈاکٹر صاحب نے انہیں نوکری سے نکال دیا ہے اورچونکہ اس کے ڈاکٹر مہر خان کےساتھ بڑے دوستانہ مراسم ہیں، وہ ان کی بحالی کے لئے مہر خان سے سفارش کرے۔

ملک جوبڑا ضدی ، مغرور اور متعصب شخص تھا ان چوکیداروں کی برطرفی پر سخت برہم اور برافروختہ ہوا۔ دونوں چوکیدار ملک مذکورہ کے لواحقین میں سے تھے۔

ملک اکثر ڈاکٹر مہرخان کے ہاں اپنے اور اپنے اہل وعیال اور رفقا کے علاج کرانے کی غرض سے آتا جاتا رہتا تھا۔ وہ ان کے مسیحی ہونے سے قدرے ناخوش تھا۔ اکثر مسیحی دین کے بارے میں دونوں تبادلہ خیالات کرتے رہتے تھے۔ مہر خان اسے مسیحیت کی تجلیوں اور خوبیوں سے روشناس کرتے رہتے تھے لیکن ملک سنی ان سنی کردیتا تھا۔ملک کے تعلقات میں بدگمانی کا ہلکا سا عکس کبھی کبھی نظر آجاتا تھا۔ اس لئے ڈاکٹر مہر خان ملک کو قابلِ اعتماد دوست نہیں سمجھتے تھے۔

ایک دن ملک ٹل شہر میں آیا تاکہ ڈاکٹر مہر خان سے بات چیت کرکے پرانے چوکیداروں کوان کے کام پر بحال کرادے۔ملک نے چوکیداروں کی تعریف کے پل باندھ دیئے اور ان کی برطرفی پرطویل بحث کرنے کے بعد ان کی بحالی پر زور دیا۔ لیکن ڈاکٹر مہر خان چونکہ عزم اور استقلال کے عظیم پیکر تھے ایسا کرنے سے مجبور تھے۔ انہوں نے سارے معاملہ کی صلح صفائی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بڑی نیک نیتی سے ملک کو نہایت ہی دوستانہ لہجہ میں کہا کہ " جس طرح یہ چوکیدار ان کے ملازم ہیں وہ خود بھی کسی کے ملازم ہیں چونکہ ان کے افسر بالا نے ان بوڑھے چوکیداروں کی برطرفی کا حکم صادر کیا تھا اس حکم کی بجاآوری ان پرلازم تھی۔ اس لئے وہ ان کو نوکری پر بحال نہیں کرسکتے، وہ بلاشبہ کافی بوڑھے ہیں اور انہیں نظر بھی کم آتا ہے اور وہ اب چوکیداری کا کام نہیں کرسکتے۔" حق گوئی کے اس معاملے میں مہر خان کا کردار فولاد کی طرح بےلچک ثابت ہوا۔ملک نے مہر خان کی باتوں پر کوئی دھیان نہ دیا بلکہ اس کی بھنویں تن گئیں اور غصے میں اس کے چہرے کے بھدے نقوش بھیانک ہوگئے۔ اس کا خیال تھا کہ ڈاکٹر مہرخان نے ان چوکیداروں کو کسی ذاتی عناد کی بنا پر برطرف کردیا تھا۔ وہ غصہ سے کسی لمحے بھی مہر خان پر ہاتھ اٹھا بیٹھتا مگر مہر خان کے رعب وادب نے ملک کو پست ہمت کردیا تھا۔ مہر خان بھی موقع شناس تھے اورملک کی ہر حرکت کا اچھی طرح سے جائزہ لے رہے تھے۔ بلاآخر ملک نے اسی عالم غیظ وغضب میں آکر ڈاکٹر مہر خان کو اوپر سے نیچے تک بڑی حقارت آمیز نظروں سے دیکھا اور پھر گرجدار آواز میں مٹھیاں بھینچ کر یہ دھمکی دی کہ " اب انہیں اس ناانصافی کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔"

آخر ڈاکٹر مہر خان کے پاس بھی تو گوشت پوست کا دل تھا۔ وہ بااصول اور نڈر آدمی تھے۔ جہاں اصول کا سوال ہوتا وہاں وہ فولاد کی طرح سخت تھے۔ اپنے دوست کا یہ نازیبا غیر منصفانہ رویہ دیکھ کر بڑے رنجیدہ ہوئے اور اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا لیکن اب ملک سے اس موضوع پر زیادہ حجت کرنی بےسود تھی۔ انہوں نے ملک کی دھمکی کو گیدڑ بھبکی اور خرافات کہہ کر ٹال دیا اور سب کچھ خدا کی مرضی پر چھوڑ دیا۔" دشمن اگر قوی است نگہبان قوی

تراست" گو انہوں نے ملک کو دھونس کو کچھ زیادہ اہمیت نہ دی تاہم انہوں نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اگر وہ چاہتے تو آسانی سے اس معاملہ میں پولیس کی امداد حاصل کر سکتے تھے ۔ لیکن پٹھانی غیرت کی بنا پر وہ ایسا کرنے سے مجبور تھے۔ ملک مایوس ہو کر منہ لٹکائے اپنے گاؤں کو لوٹ گیا۔

اس ناخوشگوار واقعہ سے ڈاکٹر مہر خان کی رات بھر سوچوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبے رہے۔دوسرے دن ان کا چہرہ افسردہ اور اس کا لہجہ بجھا بجھا سا تھا جس سے ان کے چہرے پر کھچاؤ سے پیدا ہو گیا تھا۔ ان کی زوجہ نے پوچھا، خیر تو ہے؟ وہ انہیں اس معاملہ میں اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے وہ سب باتیں جو ان کے اور ملک کے مابین ہوئی تھیں لفظ بہ لفظ اپنی اہلیہ کو سنا دیں اور انہیں تاکید کر دی کہ اگر خدانخواستہ ان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آجائے تو فلاں ملک اور اس کے فلاں فلاں ساتھی اس کے ذمہ دار ہوں گے۔ انہوں نے ان سب کے نام اپنی میڈیکل ڈائرکٹری میں قلمبند کر دیئے۔ اس کے بعد دونوں میاں بیوی اس واقعہ کے بارے میں صبر و شکر کے گھونٹ پی کر چپ ہو رہے۔

ڈاکوؤں کا حملہ

ٹھہر اب اضطراب دل کو دردِ دل رقم کرلوں
ذرا اب خامۂ رنگین کو وقف درد غم کرلوں

۱۹۱۵ء ماہ مارچ کی گیارہ تاریخ کو ہسپتال میں مریضوں کا غیر معمولی طور پر صبح سے شام تک تانتا بندھا رہا۔ ڈاکٹر مہر خان ان کے علاج معالجہ میں بے حد مصروف تھے۔ وہ دوپہر کے کھانے کے لئے تھوڑا وقت نکال کر گھر میں آئے لیکن تھوڑی دیر بعد بلاوا آنے پر کھانا چھوڑ کر پھر ہسپتال چلے گئے ۔ اتنے ڈھیر مریضوں کے علاج معالجہ کے باعث وہ تھک کر چور ہو گئے تھے۔ کوئی ایسا مریض نہ رہا تھا جس کو طبی امداد نہ ملی ہو۔ کام کرتے کرتے شام ہونے لگی۔ ڈاکٹر مہر خان اپنی ڈیوٹی ختم کر کے گھر آگئے ۔ دونوں میاں بیوی اپنے چھوٹے بچوں کے ساتھ دیر تک ہنستے بولتے رہے۔ وہ کیا جانتے تھے کہ اسی رات ان پر قیامت ٹوٹنے والی ہے اور انہیں سفاکوں کا شکار ہونا ہے۔ سونے سے پہلے حسبِ معمول ڈاکٹر مہر خان نے اپنے خاندان کے ساتھ کلامِ مقدس کی تلاوت کی اور دعا کے ساتھ ان تمام رحمتوں اور برکتوں کا جو ان کو نصیب تھیں خداوند کریم کا شکر ادا کیا۔ اس کے بعد وہ اپنے اپنے بستروں پر سونے کے لئے چلے گئے۔

رات کافی بیت چلی تھی۔ اسی رات تخمیناً سولہ قبائلی ڈاکوؤں پر مشتمل مسلح جتھے نے دبے پاؤں منظم طور پر رات کی تاریکی کے پردہ میں ڈاکٹر مہر خان کے مکان پر دھاوا بول دیا ان میں سے چند ڈاکو پہلے ڈاکٹر مہر خان کے مکان کی طرف آئے اور چشم زون ہسپتال کے چوکیداروں کو دبوچ لیا۔ وہ بچارا مکان کے دروازے کے سامنے والان میں سویا ہوا تھا۔ ان میں ایک ڈاکو نے بھری ہوئی بندوق کو نالی اس کے منہ کی طرف کر دی۔ انہوں نے اسے دھمکی دی کہ وہ اپنی جگہ پر خاموش پڑا رہے۔ اس بچارے کے ڈر کے مارے ہوش اڑ گئے اور وہ چپ پڑا رہا۔

اس کے بعد پانچ چھ ڈاکو ڈاکٹر مہر خان کے مکان کی طرف بڑھے اور ان کے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ ڈاکٹر نے جب یہ آواز سنی تو انہیں یہ خیال آیا کہ شائد کوئی مریض علاج کے لئے آیا ہے۔ سو وہ فوراً اپنی چارپائی سے اٹھے اور جلدی سے اپنی پگڑی باندھی اور چٹخنی کھول کر دروازے کے کواڑ کھول دیئے۔ لیکن جونہی دروازہ کھلا ایک لمبے تڑنگے ڈاکو نے اپنی پگڑی کی رسی بنا کر ڈاکٹر کی گردن کے گرد اگرد ڈال دی اور اس کو کمر سے باہر کھینچنے کی کوشش کرنے لگا۔ ڈاکٹر مہر خان فوراً سمجھ گئے کہ یہ ان کی جان لینے کا منصوبہ ہے۔ وہ موجودہ ناگہانی صورت حال کا سامنا کرنے کے لئے تیار نہ تھے تاہم یہ وقت سوچ کا نہیں تھا، عمل کا تھا، انہوں نے اپنے حواس بجا رکھتے ہوئے بڑی سرعت سے اس ڈاکو کو گلے سے پکڑ لیا جو عین ان کے سامنے کھڑا تھا۔ پھر اسے اس قدر جھنجوڑا کہ باقی ڈاکو ایسی سیاہ رات کی تاریکی میں گھبرا کر ادھر ادھر گر پڑے ۔ جب مہر خان نے پہلے ڈاکو کو زور سے جھنجوڑا تو

دوسرے ڈاکو ہچکولا لگنے سے اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے اور وہ سب ادھر ادھر گر پڑے۔ اس ہلچل اور شور سے ان میں اتنی گھبراہٹ پیدا ہو گئی کہ وہ سب سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ اٹھے لیکن ان کا ساتھی جس نے ڈاکٹر کی گردن میں پگڑی ڈال رکھی تھی پیچھے رہ گیا تھا۔ ڈاکٹر مہر خان نے اس ڈاکو کو گردن سے پکڑ کر کمرے کے اندر کھینچ لیا۔ کمرے کے اندر قدم رکھتے ہی انہوں نے اپنے دوسرے ہاتھ سے کواڑ کو بند کیا اور چٹخنی کو اندر سے لگانے کی کوشش کی لیکن رات کی تاریکی اور ڈاکو کی پکڑ دھکڑ کے باعث وہ اپنے اس مقصد کو پورا نہ کر سکے۔ ادھر اس ڈاکو نے بڑے زور سے چلانا شروع کر دیا اور اپنے بھگوڑے ساتھیوں کو ان کی بزدلی پر گالیاں دینے اور مدد کے لئے پکارنے لگا کیونکہ اس کو اندیشہ تھا کہ کہیں ڈاکٹر مہر خان اس کا کام تمام نہ کر دیں۔

ڈاکوؤں کا گروہ اپنے ساتھی کی چیخ و پکار سن کر گھر سے کچھ دور جا کر رک گیا۔ اس گروہ میں اس ڈاکو کا سگا بھائی بھی شامل تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو مجبور کیا کہ وہ واپس جا کر دوبارہ حملہ کریں۔ اس نازک لمحہ میں اگرچہ ڈاکٹر مہر خان کے اڑوس پڑوس کے سب لوگ ڈاکوؤں کے شور وغل سے مانوس تھے لیکن خوف وہراس سے انہیں تو سانپ سونگھ گیا تھا اور وہ سہمے ہوئے اپنے اپنے گھروں کے اندر دبک کر بیٹھے رہے۔ اگر یہ ہمسائے اپنے گھروں کی محفوظ چار دیواری میں بیٹھے ہوئے ذرا بھی انسان دوستی جوانمردی اور دلیری کا مظاہرہ کرتے جو محض چند پٹاخے چلانے سے ہوسکتا تھا۔ تو بارڈر پولیس جو قریب ہی ایک قلعہ میں مقیم تھی ان پٹاخوں کی آواز سن کر فوراً مدد کے لئے موقع پر پہنچ جاتی اور بہت ممکن تھا کہ پولیس کے پہنچنے سے پہلے ڈاکو خوف زدہ ہو کر بھاگ اٹھتے۔ اس زمانہ میں ٹل شہر میں عموماً ہر ایک گھر میں پٹاخے رکھے ہوتے تھے اور رات کو جب کبھی اہلِ خانہ کو کسی سنگین خطرہ کی صورت میں پولیس کی مدد درکار ہوتی تھی تو وہ ان پٹاخوں کو چلاتا تھا جس کی آواز سن کر پولیس فوراً موقع پر مدد کے لئے پہنچ جاتی تھی۔

ڈاکٹر مہر خان کے مکان کے دوسرے کمرے میں ان کی زوجہ محترمہ اور ان کے دو کمسن بچے، اشرف اور جوئیل، گہری نیند سو رہے تھے۔ (ان کا تیسرا بچہ یرمیاہ خان ان دنوں ملتان میں ایبگیل مشن ہائی اسکول میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا) وہ اس سنگین واقعہ سے بالکل بے خبر تھے۔ چند منٹ پہلے کسی قدر کھٹکا ہونے سے اور ڈاکٹر مہر خان کو اپنی پگڑی باندھنے کی ہلکی سے سرسراہٹ کی آواز سے ان کی زوجہ چونک اٹھی تھیں تو انہیں کچھ تشویش ہوئی۔ "بھلا یہ بھی کوئی وقت ہے کسی کو تکلیف دینے کا۔" انہوں نے دل ہی دل میں کہا اور غنودگی کے عالم میں لیٹے لیٹے مہر خان کو خبردار کر دیا تھا کہ مکان سے باہر نہ نکلنا اور اگر نکلو بھی تو پہلے ہر طرح کی ذاتی حفاظت کا انتظام کر لینا جس کے لئے بھرا ہوا پستول ان کے تکیہ کے نیچے رکھا ہوتا تھا۔ لیکن جیسے کے پہلے بھی بتایا جا چکا ہے، ڈاکٹر مہر خان کی یہ عادت تھی کہ وہ عام طور پر رات کے وقت ہسپتال کی گشت کیا کرتے تھے لہذا ان کی زوجہ نے یہی سمجھا کہ وہ شاید اپنے معمول کے مطابق گشت لگانے کے لئے تیار ہو رہے ہیں۔

ادھر سب کے سب ڈاکو واپس لوٹ آئے اور اس کمرے میں داخل ہو گئے جہاں ڈاکٹر نے ان کے ساتھی کو گلے سے پکڑ رکھا تھا۔ سب ڈاکو مہر خان پر جھپٹ پڑے اور اپنے ساتھی کو ان کی گرفت سے چھڑا لیا۔ بعد ازاں ڈاکوؤں اور ڈاکٹر مہر خان کے مابین کچھ دیر مار پیٹ ہوتی رہی۔ بالآخر وہ ڈاکٹر کو کھینچ کر دالان میں لے آئے ان کے ساتھ ہی وہ ان کا بستر، پلنگ پوش، تکیہ وغیرہ بھی اٹھا کر لے گئے۔

ایمان کی گواہی

ڈاکوؤں نے ڈاکٹر مہر خان کو دعوت دی کہ اگر وہ مسیحی دین سے انحراف کر کے اپنے آبائی دین کو قبول کر لیں تو ان کی جان بخشی ہوسکتی ہے ورنہ وہ ان کی بوٹی بوٹی کر دیں گے۔ لیکن مہر خان اپنے عقیدے کے اظہار میں کسی مصلحت کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ وہ اپنے مسیحی ایمان میں بڑے مضبوط و مستحکم تھے اور مسیحی دین کی بقا کی خاطر ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار تھے۔ ان کی طبیعت کا سانچہ اتنا پختہ ہو چکا تھا کہ اسے توڑا جاسکتا تھا مگر موڑا نہیں جاسکتا تھا۔ سیدنا مسیح کی محبت ان کی رگ رگ میں بسی ہوئی تھی۔ وہ مسیح کے سچے پیرو ہوتے ہوئے اس تن

من دھن نثار کرنے کے لئے تیار تھے۔ چونکہ وہ حق گو اور حق پرست تھے انہوں نے غیر معمولی قوت ایمانی اور جرات وشجاعت کا مظاہرہ کرتےہوئے ان کی دعوت کو ٹھکرادیا اور کمال اطمینان اور صاف گوئی سے اپنے دین کی سر بلندی پر اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنے مسیحی ایمان کا اقرار کیا۔ڈاکو یہ سن کر چراغ پا ہوگئے ۔ ان کی آنکھوں سے انگارے برسنے لگے۔ انہوں نے فدیہ وصول کرنے کی خاطر ان کو اغوا کرنے کی بھی کوشش کی لیکن مہر خان کی مقاومت کے باعث وہ کامیاب نہ ہوسکے ۔ ان کی حالت دیدنی تھی۔ وہ غصہ سے آگ بگولا ہورہے تھے۔ آخر وہ ان پر ٹوٹ پڑے اور خنجروں کے پے درپے وار کر خون میں لت پت کردیا مگر وہ پہاڑ کی طرح اپنے موقف پر قائم رہے اور اپنے مسیحی ایمان کا صاف صاف اعتراف کرتے رہے۔ اس اذیت اور جان کنی کی حالت میں ڈاکٹر مہر خان نے اف تک بھی نہ کی۔ وہ ان کاری زخموں کے باعث جن سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے زمین پر گرگئے ۔ جب تک ان میں سانس کی آمدورفت باقی رہی ان کے لب پر اپنے قاتلوں پر نہ کوئی شکوہ تھا نہ کوئی گلہ۔ وہ ان کو دعائیں دیتے رہے۔ کچھ دیر تک موت وحیات کی کشمکش میں رہ کر اس جہان فانی سے کوچ کرکے اس عالمِ جاودانی میں داخل ہوگئے ۔ ان کی موت ایک باوقار موت تھی۔ شہادت کی موت۔ شہید مرتے نہیں، زندہ جاوید رہتے ہیں۔

انجیل مقدس میں مرقوم ہے:

۱۔"اس (سیدنا مسیح) نے سب سے کہا اگر کوئی میرے پیچھے آنا چاہے تو اپنی خودی سے انکار کرے اور ہرروز اپنی صلیب اٹھائے اور میرے پیچھے ہولے ۔ کیونکہ جو کوئی اپنی جان بچانا چاہے وہ اسے کھوئے گا اور جو کوئی میری خاطر اپنی جان کھوئے وہی اسے بچائے گا۔"

(انجیل شریف بہ مطابق حضرت لوقا ۹، آیت ۲۳ تا ۲۴)۔

۲۔ " بعض (ایمان ہی کے سبب سے) مار کھاتے کھاتے مرگئے مگر رہائی منظور نہ کی تاکہ ان کو بہتر قیامت نصیب ہو۔"

(انجیل شریف خطِ عبرانیوں ۱۱، آیت ۳۵)۔

۳۔ " اس کے بعد نہ کبھی ان کو بھوک لگے گی نہ پیاس اور نہ کبھی ان کو دھوپ ستائے گی نہ گرمی۔ کیونکہ جو برہ تخت کے بیچ میں ہے وہ ان کی گلہ بانی کرے گا اور انہیں آبِ حیات کے چشموں کے پاس لے جائے گا اور خدا ان کی آنکھوں کے سب آنسو پونچھ دے گا۔"

(انجیل شریف، کتابِ مکاشفہ ۷، آیت ۱۶ تا ۱۷)۔

دلاور باپ کا دلاور بیٹا

اسی اثنا میں چار ڈاکو ڈاکٹر مہر خان کی زوجہ محترمہ کے کمرہ خاص میں داخل ہوئے اور لوٹ کھسوٹ شروع کردی۔ ان میں سے دو ڈاکو تو سیدھے اس الماری کی طرف لپکے جس میں ہسپتال کی رقم رکھی ہوئی تھی۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ گھر کے چپے چپے سے واقف تھے۔ انہوں نے کمرے کا ایک ایک گوشہ چھان مارا۔ اتنے میں اچانک ان کی نظر ڈاکٹر مہر خان کے سات سالہ بیٹے اشرف خان پر پڑی جو ایک چارپائی پر سو رہا تھا۔ ایک ڈاکو نے اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ ان کے قدموں کی چاپ سن کر بڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ تاڑ گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ جب ڈاکو نے اشرف خان پر ایک خوفناک بلّے کی طرح جھپٹا مارا تو دہشت کی ایک لہر اس کے رگ وپے میں دوڑ گئی اور خوف سے اس پر کپکپی طاری ہو گئی۔ پھر بھی اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، بڑی ہمت اور پامردی سے انتہائی چابکدستی سے جھٹ اپنا بوٹ اٹھایا اور بڑی تیزی سے ڈاکو کے منہ پر دے مارا جس کے باعث ڈاکو کی ایک آنکھ پر بھی کافی ضرب لگی۔ پھر وہ بڑی سرعت سے ایک طرف سے دوسری طرف ہو کر چارپائی کے نیچے گھس گیا اور سمٹ سمٹا کر ایک کونے میں دبک گیا۔ مثلِ مشہور ہے کہ " ہمت مرداں مدد خدا " ۔

ڈاکو جس نے اشرف خان سے منہ کی کھائی تھی چکر میں آکر کسی قدر بوکھلا گیا اور غصے سے بھوت ہو گیا۔ ڈاکو کو یہ سودا کچھ مہنگا ہی پڑا گرچہ بوٹ کی چوٹ نے اب اسے اپنے شکار کو آسانی سے دیکھنے اور پکڑنے کے قابل نہ رکھا تھا پھر بھی وہ اپنے اندازے کے مطابق اشرف خان کو ادھر ادھر ڈھونڈتا رہا اور کافی دیر تک اپنی بندوق کے کندے سے اسے چارپائی کے نیچے ٹٹولتا رہا۔ بہر حال وہ اس ظالم ڈاکو کے ہاتھ نہ آیا۔

ڈاکو نے جب محسوس کیا کہ وقت گزرتا جارہا ہے اور اشرف خان اس کے ہاتھ لگ نہیں رہا تو اس نے غالباً تھک ہار کر اس کا خیال چھوڑ دیا اور پھر لوٹ کھسوٹ پر ٹوٹ پڑا۔

ماں کی ممتا

ڈاکٹر مہر خان کا سب سے چھوٹا لڑکا جوئیل جس کی عمر قریباً پانچ سال تھی اپنی ماں کی بغل میں سو رہا تھا۔ دونوں ماں بیٹا ڈاکوؤں کی لوٹ کھسوٹ کے شور سے چونک اٹھتے ہی اور بری طرح خوفزدہ تھے اور وہ بخود ہو کر چارپائی پر بیٹھ گئے ۔ کسی انجانے خوف سے ان کا جسم بے تحاشا کانپنے اور دل دھک دھک کرنے لگا۔ ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پھر بھی جلدی سے انہوں نے اپنے آپ پر قابو پالیا اور کانپتے ہاتھوں سے فوراً اپنے بیٹے کو چھاتی سے لگالیا۔ دونوں کا سانس زور زور سے چل رہا تھا۔ دو ڈاکو ان کی طرف بڑھے اور جوئیل کو اغوا کرنے کے لئے اس کی ماں سے چھیننے کی کوشش کرنے لگے ۔ انہوں نے اس بچاری ماں پر گھونسوں کی بارش کردی اور اس کے منہ کو نوچنا اور سر کے بالوں کو کھینچنا شروع کردیا۔ پھر بھی وہ اس کے لختِ جگر کو اس سے علیحدہ نہ کرسکے۔ کچھ دیر تک ماں اور ڈاکوؤں کے مابین کھینچا تانی اور چھینا جھپٹی ہوتی رہی جس سے ان کے کپڑے تار تار ہوگئے لیکن ڈاکو ان کے جگر کے ٹکڑے کو اس سے چھین نہ سکے۔ ان میں سے ایک ڈاکو نے تنگ آکر اپنی بندوق کا کندہ ماں کے سر اور کمر پر مارا جس سے وہ لہو لہان ہو گئیں اور یوں جوئیل کو ان کی گرفت سے نکال لیا۔ وہ فوراً چارپائی سے اٹھیں اور چیل کی طرح ڈاکو پر جھپٹیں اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئیں لیکن وہ ڈاکو کی ٹانگوں کو بہت دیر تک اپنی گرفت میں نہ رکھ سکیں۔ دوسرے ساتھی نے انہیں ٹھڈے مار مار کر اپنے ساتھی کو اس کی گرفت سے چھڑالیا۔ اور جوئیل کو اٹھا کر گھر سے باہر لے گئے ۔ جوئیل نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے ڈاکو کا چہرہ نوچنے اور اس کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا کیونکہ ڈاکو نے اسے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ تاہم زخمی ماں اپنے دکھ اور کرب کی مطلق پرواہ نہ کی اور انتہائی سردارت کی تاریکی میں گرتی پڑتی ننگے سر اپنے جگرے کے ٹکڑے کو وحشیوں سے چنگل سے چھڑانے کے لئے شیرنی کی طرح بے خوف ان کا تعاقب کرنے لگیں۔ جونہی وہ اپنے کمرہ کے دروازہ سے نکلیں ، دو ڈاکو جو

کواڑ کے پیچھے چھپے ہوئے تھے اور کلہاڑیوں سے مسلح تھے۔ ایک نے ان کے سر پر کلہاڑی کا الٹا حصہ مارا اور انہیں روکنے کی کوشش کی لیکن وہ ان کو دھکیلتی ہوئی آگے بڑھی چلی گئیں۔ دراصل یہ دونوں پرانے چوکیدار تھے اور وہ ان کو پہچان گئی تھیں۔ اپنے نور چشم کی گریہ وزاری انہیں ڈاکوؤں کے پیچھے پتھریلے اور ناہموار پہاڑی راستے پر کھینچ لے گئی۔ وہ روتی پیٹتی اور چلاتی ہوئی ان کا پیچھا کرتی رہیں اور ان سے متواتر منت زاری کرتی ہیں کہ وہ ان کا دلارا بیٹا انہیں واپس دے دیں لیکن سب بے سود۔

اب ڈاکو شہر سے تقریباً دو میل باہر نکل کر دریائے قرم کے کنارے پر آپہنچے۔ انہوں نے دریا کو عبور کرکے غنیر علاقہ میں داخل ہونا تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ لڑکے کی ماں ان کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنا پیچھا چھڑانے کے لئے ان پر پتھراؤ کرنا شروع کردیا۔ پاؤں میں چھالے، تلووں سے رستا ہوا خون، ہاتھوں پر خراشیں، نچے ہوئے بال اور پھر ان کے پتھروں کی چوٹیں کھا کھا کر شامت زدہ ماں کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ وہ خون میں غلطاں ہو کر زمین پر گر پڑیں اور بیہوش ہو گئیں۔

کچھ دیر کے بعد دریائے قرم کے نواحی گاؤں کے چند افراد مدد کے لئے موقع پر پہنچ گئے لیکن دیر ہونے کی وجہ سے وہ مدد نہ کر سکے کیونکہ تب تک ڈاکو جوئیل کو اٹھا کر قرم دریا پار کرکے غنیر علاقہ میں داخل ہو گئے تھے۔

جب صبح ہوئی تو جوئیل کی ماں کو ہوش آیا۔ ان کا ایک ایک بند درد کر رہا تھا۔ وہ کافی کمزور اور زخمی تھیں۔ ایسی سخت اور خون جما دینے والی ٹھنڈ میں پسینے کے قطرے ان کے چہرے پر جھلک رہے تھے۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ ظالم ان کی آنکھوں کے تارے کو لے جا چکے ہیں۔ چنانچہ وہ حال سے بے حال اور زخموں سے نڈھال اپنے بجھے ہوئے دل اور بوجھل قدموں کے ساتھ گرتی پڑتی اور لڑکھڑاتی ہوئی اپنے اجڑے اور لٹے پٹے گھر کی طرف چل پڑیں۔

ہسپتال کے درودیوار اداس اور ویران تھے۔ خدا خدا کرکے وہ تھک ہار کر گھر پہنچ گئیں۔ گھر میں عجیب طرح کا سناٹا تھا۔ جب وہ دروازے کے قریب آئیں تو ان کا پاؤں اس کے خوادن کے گھایل اور خون سے لت پت جسم سے ٹکرایا۔ یہ دیکھ کر ان کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی اور ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے ان کے سینہ میں خنجر گھونپ دیا ہے۔ اس بچاری مصیبت کی ماری کا اب تک یہی خیال تھا کہ شاید وہ ظالم اور کینہ پرور ڈاکو ان کے سرتاج کو بھی پکڑ کر لے گئے ہیں لیکن اب ان پر سب حقیقت آشکارا ہو گئی۔ وہ دم بخود اور ساکت ومصامت ان کی طرف دیکھتی رہیں۔ اس وقت مہر خان میں ابھی تک جان تھی۔ اگر انہیں فوری طور سے طبی امداد مل جاتی تو وہ یقیناً جانبر ہوسکتے تھے لیکن ایسے مشکل وقت میں طبی امداد ملنی ناممکن بات تھی۔ ان کا خون بہہ چکا تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ اپنے معبود حقیقی سے جا ملے۔ اس مصیبت کی ماری کا سورج ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا اور وہ شل اور سراسیمہ ہو گئی۔ ظالموں نے ایک ہنستے ہنستے گھر کو تھوڑی دیر میں تباہ اور برباد کردیا۔

ابھی یہ دلدوز منظر ان کی آنکھوں کے سامنے ہی تھا کہ انہوں نے اپنے چھوٹے بیٹے اشرف کو دیکھا جو گھر سے نکلا اور اندھیرے میں روتا، گرتا پڑتا ہوا صحن میں آگیا۔ وہ سخت سردی میں ٹھٹھر رہا تھا۔ وہ اکیلا اور بے آسرا اور تباہی کا مارا اپنے سنسان گھر میں گھنٹوں مدد کے واسطے چیخ وپکار کرتا رہا تھا لیکن کسی نے اس کو سہارا نہ دیا۔ وہ سب اپنے گھروں کے دروازے بند کئے ہوئے دبک کر بیٹھے رہے۔ وہ بآسانی پیار کے دو بولوں سے اسے اپنے گھر میں پناہ دے سکتے تھے۔ اور تو اور نیا چوکیدار جس کو ڈاکوؤں نے دبوچ رکھا تھا وہ بھی موقع واردات سے غائب ہو گیا تھا۔

دکھی ماں نے جب اپنے بیٹے اشرف کو ایسی خستہ حالت میں دیکھا تو انہیں اپنے ہمسایوں کی بے حسی، سرد مہری اور بے اعتنائی پر بڑا دکھ ہوا۔ بے بس اور بے کس ماں کی آنکھوں سے آنسو ساون بھادوں کی بارش کی طرح برسنے لگے۔ انہوں نے فوراً اپنے بیٹے کا بازو تھام لیا، سر پر ہاتھ پھیر اور اسے مکان کے اندر لے گئیں۔ گھر کی دنیا ہی بدل چکی تھی۔ ہر طرف ابتری پھیلی ہوئی تھی، سامان بکھرا پڑا تھا اور ہر چیز الٹ پلٹ تھی۔ انہوں نے جلدی

سے دو پٹاخے چلائے ۔ چونکہ وہ ان کے صحیح استعمال سے ناواقف تھیں پہلا پٹاخہ ہاتھ میں ہی چل گیا جس سے ان کے ہاتھ اور منہ جھلس گئے ۔ پٹاخوں کی آواز سن کر تھوڑی دیر کے بعد بارڈر پولیس بھی موقع پر پہنچ گئی لیکن وہ ان کی کچھ مدد نہ کر سکتی تھی کیونکہ ڈاکو بڑی دیر سے غیر علاقہ میں پہنچ چکے تھے۔

صبح ہوتے ہی اس لرزہ خیز واقعہ کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی ۔ شہر میں کھرام مچ گیا۔ آس پاس کی گلیاں آہوں اور سسکیوں میں ڈوب گئیں اور مرحوم کی رہائش گاہ پر جم غفیر جمع ہو گیا جن میں کثیر التعداد میں ان کے شناسائی اور ایسے مریض تھے جو ان کے ہاتھوں شفا پا چکے تھے۔ ہر شخص افسردہ اور غم میں ڈوبا ہوا تھا۔ متعدد افراد تو بلک بلک کر رو رہے تھے۔ عوام نے مرحوم کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا اور ان کے پسماندگان کو تسلی دی۔ اس وقت مہر خان کی عمر تخمیناً ۴۷ برس تھی۔ یہ بھی کوئی مرنے کی عمر تھی۔ ٹل کے شہریوں نے ان سے بہت سی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ مرحوم ایک مرد مومن تھے اور موت کی زندگی میں بار بار یاد کرنا مردِ مومن کی خاص صفت بتائی گئی ہے۔ ان کی موت شہادت کی موت تھی۔

مستری فضل دین جو ان دنوں بنوں سے ٹل ہسپتال میں کسی کام کے لئے آیا ہوا تھا اس نے بنوں مشن ہسپتال کے حکام کو اس معاملہ کے بارے میں بذریعہ تار مطلع کر دیا۔ تار ملتے ہی پادری ایم ای ۔وگرم صاحب اور ڈاکٹر سی۔واسپر بیوہ کی مدد کے لئے ڈاکٹر مسز پینل صاحبہ کی موٹر لے کر فوراً ٹل پہنچ گئے۔ خبر ملتے ہی ڈاکٹر جہاں خان انچارج مشن ہسپتال کرک (ضلع کوہاٹ) بھی مدد کے لئے چھوٹے پہاڑی راستے سے ہوتے ہوئے ٹل پہنچ گئے۔

لاش کا پوسٹ مارٹم میجر لیو نرڈ اور ڈاکٹر سی ۔واسپر کیا۔ بعد ازاں پادری وگرم صاحب نے ۱۳ مارچ ۱۹۱۵ء کو تکفین اور تدفین کا اہتمام کر کے انہیں ٹل کے فوجی گورا قبرستان میں سپرد خاک کر دیا۔ جب جنازہ اٹھایا گیا تو کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو پر غم نہ تھی۔

شادی شدہ بیٹی

عین انہی ایام میں ایک اور اندوہناک واقعہ پیش آیا جس کے تصور ہی سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ ڈاکٹر مہر خان کی ایک شادی شدہ بیٹی لاہور میں رہتی تھی۔ اس کے ہاں پہلوٹھا بیٹا پیدا ہوا۔ جب باپ کو خبر ملی تو اس نے بیٹی کو بڑے پیار سے ٹل آنے کی دعوت دی ۔خیال تھا کہ بیٹی چند روز ماں باپ کے گھر میں رہے گی اور نانا نانی ننھے منے کو دیکھ کر دل بہلائیں گے۔ چنانچہ بیٹی نے باپ کی دعوت کو فوراً قبول کیا اور ننھے منے کو اپنے ہمراہ لے کر ریل گاڑی کا قریباً تین سو پچاس میل کا کٹھن سفر کر کے اسی روز ٹل میں اپنے باپ کے گھر پہنچ گئی۔ لیکن والد ہمیشہ کی نیند سو چکے تھے۔ درودیوار سے افسردگی نمایاں تھی۔ ایک خوش وخرم گھرانہ ماتم کدہ بنا ہوا تھا اور ہر طرف اداسی اور ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔

اف خدایا! کس قیامت کا منظر تھا۔ جس کا تصور دل کو پارہ پارہ کر دینے اور جگر کو شق کر دینے کے لئے کافی تھا۔ بیٹی کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ وہ زندہ باپ کو مل نہ سکی۔

ڈاکٹر مہر خان جو اپنی بیٹی کو دیکھنے کے لئے ترس رہے تھے آج بستر مرگ پر لیٹے تھے۔ ہائے افسوس کہ وہ جوان کی آمد کے لئے گھڑیاں گن رہے تھے، آج اس قابل نہ تھے کہ اٹھ کر بیٹی کو پیار کر لیتے اور اس کے ننھے منے کو اپنی گود میں لیتے ۔ بیٹی لاش پدر سے چمٹ کر پھوٹ پھوٹ رونے لگی۔

یہ بیٹی جس کا نام ایلس تھا انگریزی اور پشتو زبانوں پر پوری دسترس رکھتی تھی۔ اس وقوعہ کے بعد جب جوئیل کی تلاش کا مسئلہ درپیش ہوا تو ایلس نے اس کام میں سب سے زیادہ دوڑ دھوپ کی اور اس سلسلہ میں کئی مقامات پر جا کر متعدد اعلیٰ سرکاری افسروں سے ملی تا کہ وہ سب اپنے اثر و رسوخ سے جوئیل کی تلاش میں حصہ لیں اور اپنی کوششیں جاری رکھیں جب تک اسے تلاش نہ کر لیں۔

نوٹ: ایلس اوراس کی بڑی بہن جین غالباً ۱۵ اور ۱۷ سال کی تھیں جب وہ دونوں بنوں مشن ہسپتال نرسنگ کی تربیت حاصل کررہی تھیں۔ ڈاکٹر پینل صاحب کی فرشتہ خصلت والدہ انہیں بہت پیار کرتی تھیں۔ ایک دن وہ سخت بیمار ہوگئیں انہیں علاج کے لئے شیخ بدین پہاڑہ (ضلع ڈیرہ اسماعیل خان) کے ایک مشہور صحت افزا مقام پر بھیجا گیا۔ نرسوں میں سے وہ صرف ان دو بہنوں کو اپنے ہمراہ لے گئیں حالانکہ وہاں کی انگریز نرسیں ان کے ساتھ جانے کی خواہش مند تھیں۔ ان کی بیماری مہلک ثابت ہوئی اور وہ مذکورہ پہاڑ پر ۸ جون ۱۹۰۸ء کو رحلت کر گئیں۔ اس وقت ان کی عمر ۳۷ برس تھی۔

ایلس کی بڑی بہن جین کی شادی ایک متمول اعلیٰ خاندان کے چشم وچراغ سے ہوئی تھی لیکن بد قسمتی سے ایک سال کے بعد وہ بھی ایک ہیبت ناک حادثہ کی بھینٹ چڑھ گئی۔ ایک رات اپنی بیٹی ایسنی کو موسلادھار بارش میں گھر کی گرتی ہوئی چھت سے بچانے کی خاطر گھر سے باہر دوڑتے ہوئے ایک شہتیر کی زد میں آکر جان بحق ہوگئی لیکن اس کی ننھی منی ایسنی کو خراش تک بھی نہ آئی۔ آج ایسنی بال بچوں والی ہے۔

ٹل سے ہجرت

چند دنوں کے بعد ڈاکٹر مہر خان کی اہلیہ مع اپنے بیٹے اشرف خان اور بیٹی ایلس اوراس کا ننھا منا ٹل سے ہجرت کرکے بنوں چلے گئے۔

اپنے ساتھی کے ہمیشہ کے لئے بچھڑجانے سے وہ اب اپنے اور اپنے بچوں کے ذریعہ معاش اور مستقبل کے بارے میں گہری سوچ میں رہنے لگیں کہ اب یہ پہاڑ جیسی زندگی کیسے گزارینگی۔ جیون ساتھی ایک اچانک اور بھیانک موت نے ان کے گھر کا شیرازہ بکھیر دیا تھا۔ ان کے بچے پل بھر میں یتیم اور والد کے دست شفقت سے محروم ہوگئے اب ان کی زندگی کا ایک ایساطویل سفر شروع ہوا جس میں خوش، غم، تکالیف اورراحتوں کو اکیلے ہی محسوس کرنا تھا۔ ان کی آنکھوں میں ستارے جھلملانے لگتے۔ آنسو تو مقدر کے ساتھ ہیں ہمیشہ آتے رہیں گے لیکن جانے والے کبھی واپس نہیں آتے۔

انسان تنہا اس دنیا میں آیا ہے اور اسے تنہا ہی زندہ رہنا ہے اور پھر اکیلے اس جہاں سے چلے جانا ہے۔ پھر اس قدر آرزو ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ انہوں نے ٹھنڈی سانس بھر کر اپنے آپ کو تسلی دی۔

آخر کار انہوں نے مشن ہسپتال میں مریضوں کو خوراک بانٹنے کی ملازمت اختیار کرلی۔ ان کا بیٹا یرمیاہ بھی ملتان سے بنوں آگیا۔ اس طرح وہ گھر کی گاڑی کو ایک مدت تک کھینچتی رہیں اور تنگی ترشی سے گزار ہوتا گیا۔ انہوں نے خود دکھ جھیلے اور مصائب کا سامنا کیا مگر اپنی اولاد کو کوئی تکلیف نہ ہونے دی۔

دیگر مصائب

اس کے بعد دیگر آلام ومصائب کا دور شروع ہوا۔

اول۔ ڈاکوؤں کی تلاش و تفتیش اور ان کی سزا کا مسئلہ۔

دوم۔ جوئیل کو ڈاکوؤں کے پنجہ سے چھڑانے کا کام۔

ڈاکٹر مہر خان کے قتل کی خبر سنتے ہی کیپٹن فرانسس ہمفری جو کوہاٹ کے ڈپٹی کمشنر تھے، تمام صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے موقع واردات پر پہنچ گئے۔ مہر خان کی اہلیہ نے کیپٹن صاحب سے سارے حالات وواقعات بیان کردیئے۔ مفصل بیان سن کر وہ دم بخود ہو کر رہ گئے۔ ان کے مہر خان کے ساتھ بڑے دوستانہ تعلقات تھے انہیں اس بات پر تعجب ہوا کہ مہر خان کے کبھی بھی ان کے روبرو اپنے دشمنوں کا تذکرہ نہ کیا۔ وہ چاہتے تو ایسے زبردست حاکم الوقت کے سامنے اپنے سب دشمنوں کو بے نقاب کردیتے لیکن پٹھانی غیرت نے ایسا کرنے سے روک دیا۔ ان کا فرزند ارجمند یرمیاہ خان ان دنوں ۱۴ برس کا تھا جو ابھی تک اس غمناک منظر کو نہیں بھولا تھا۔ جب کیپٹن ہمفری اس معاملہ میں بنوں تشریف لائے تو اپنے عزیزدوست کی دکھی بیوہ اور بچوں کو دیکھ کر ان کا جی بھر آیا اور آنکھیں پرنم ہوگئیں۔

جب قتل وڈاکہ زنی کی تفتیش شروع ہوئی تو ٹل کے تقریباً ایک سو مشکوک بالغ افراد کو مہر خان کی زوجہ سے سامنے پیش کیا گیا تاکہ وہ ڈاکوؤں کی شناخت کرے۔ لیکن اس اللہ کی بندی نے ان میں سے کسی پر بھی ہاتھ نہ رکھا۔ حالانکہ کئی حامیوں نے انہیں ترغیب دی تھی کہ فلاں فلاں اشخاص کو اس مقدمہ میں ملوث کردو۔

حکومت نے اس سنگین جرم کے سلسلہ میں وہاں کے شہریوں سے بصورت جرمانہ یا خون بہا ایک خطیر رقم ڈاکٹر مہر خان کی زوجہ کے لئے وصول کی۔ لیکن وہ بڑی غیرت مند خاتون تھیں۔ انہیں یہ خیال آیا کہ وہ اپنے شوہر کے خون کی قیمت لے رہی ہیں۔ یہ بات انہیں ہرگز پسند نہ آئی سو انہوں نے یہ رقم ڈاکٹر پینل صاحب کو دیدی تاکہ وہ بنوں مشن ہسپتال کے مریضوں پر خرچ کی جائے۔ آخر کار گواہی پر چار اشخاص کو گرفتار کرلیا گیا۔

پہلا مجرم وہی ملک تھا جو کہنے کو مہر خان کا دوست تھا، جس نے کسی وقت چوکیداروں کی برطرفی کے معاملہ میں دھمکی دی تھی کہ اسے اس فعل کا خمیازہ اٹھانا پڑے گا جو اس کی جان پر نہایت گراں ہوگا۔ گرفتاری سے پیشتر ملک نے ڈاکٹر مہر خان کی زوجہ کی بڑی منت وسماجت کی کہ وہ اسے اس جرم میں نہ پکڑوائے لیکن وہ ایسا کرنے پر رضامند نہ تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ ان کے مکان پر ڈاکوؤں کا حملہ ملک کے ایک منظم منصوبے کے تحت کیا گیا تھا۔ اسی ملک کا نام مہر خان نے کچھ مدت پہلے انہیں صاف صاف بتایا تھا کہ اگر ان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آئے تو فلاں ملک اور اسکے فلاں فلاں ساتھی اس کے ذمہ دار ہوں گے۔ اس کے لئے یہی ایک یقینی ثبوت تھا کہ ملک کی ایما پر اس کے خاوند کو قتل کیا گیا تھا۔ ملک بڑا ضدی اور اڑیل تھا اور کسی طرح اقبال جرم پر آمادہ نہ ہوا۔ اس نے اپنے مطلب براری کے لئے طرح طرح کے حربے استعمال کئے ور بے دریغ روپیہ خرچ کرتا رہا لیکن وہ اپنے منشا میں کامیاب نہ ہوسکا۔

دوسرے دو مجرم ہسپتال کے وہی پرانے چوکیدار تھے جنہیں کچھ مدت پہلے ڈاکٹر مہر خان نے ملازمت سے برطرف کردیا تھا۔

تیسرا مجرم ان پرانے برطرف شدہ چوکیداروں کا ایک ساتھی تھا۔

ڈاکٹر مہر خان نے اس واقعہ سے کئی روز پہلے ان سب افراد کے نام نہ صرف اپنی زوجہ کو بتادیئے تھے بلکہ ان کے نام اپنی میڈیکل ڈائرکٹری میں بھی قلمبند کردیئے تھے۔ چنانچہ یہ مقدمہ ٹیری کے نواب کی عدالت میں سماعت کے لئے شروع ہوا۔ اگرچہ مذکورہ اشخاص کے خلاف عینی شاہد یا کوئی خاص اثبات پیش نہیں کئے گئے تھے تاہم عدالت نے ان سب کو واقعات وحالات کے تحت مجرمین قرار دے دیا تھا۔

اول۔ دونوں چوکیداروں کو مہر خان کی زوجہ نے پہچان لیا تھا۔ وقوعہ کے وقت جب ڈاکو جوئیل کو اس کی ماں کی گرفت سے نکال کر فرار ہوگئے تھے اور وہ ان کا تعاقب کررہی

تھیں تو یہ دونوں چوکیدار جنہوں نے اپنے چہروں پر پگڑی لپیٹ رکھی تھی کمرے کے دروازے کے کواڑ کے پیچھے چھپے ہوئے تھے، انہیں وہ پہچان گئی تھیں۔ان میں سے ایک نے ان کو کلہاڑی مار کر روکنے کی کوشش کی تھی۔

دوم۔ یہ بات بھی بڑی حیرت افزا تھی کہ ڈاکٹر مہر خان کے دو خونخوار کتے جو کسی اجنبی شخص کو گھر کے قریب پھٹکنے نہ دیتے تھے وہ بھی واردات کی رات کو گھر سے غائب تھے ، وہ دوسرے ہی دن گھر آئے ۔ گھر آتے ہی انہوں نے اپنی واپسی کی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے سونگھ سونگھ کر اشرف اور اس کی والدہ کو تلاش کرکے ان کے پیروں کی چوما چاٹی شروع کردی لیکن تھوڑی دیر بعد گھر میں خاموشی اور اسی کی اجڑی حالت دیکھ کر گم صم ہوگئے ۔ یہ کتے پرانے چوکیداروں کے ساتھ گھلے ملے ہوئے تھے۔ وہ ان کو ڈاکہ زنی سے کچھ دیر پہلے اپنے گاؤں لے گئے تھے۔

سوم۔ میڈیکل ڈائرکٹری بھی غائب تھی جس میں مہر خان نے اپنے دشمنوں کے نام لکھ رکھے تھے۔ وہ اس کتاب کو بڑی حفاظت سے اپنے تکیئے کے نیچے رکھا کرتے تھے۔ ڈاکو ان کا بستر اور تکیہ بھی اٹھا کر لے گئے تھے۔

آخر وہ دن بھی آگیا جس دن عدالت نے اپنا فیصلہ سنانا تھا۔ مرحوم کی بیوہ اور ان کی شادی شدہ بیٹی ایلس بھی عدالت میں حاضر تھیں ۔ اور ان کے ہمراہ پادری وگرم صاحب اور ڈاکٹر واسپر صاحب بھی تھے۔اس دن کمرہ عدالت لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تندو تیز بحث جاری تھی، باہر احاطے میں بھی تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ ملک کو اس کی مجرمانہ ضمیر کی ملامت نے بے حال کر رکھا تھا۔ انہی ایام میں ملک کے کنبہ میں کسی بیماری کے باعث دو عزیز ایک ہی ہفتہ میں یکے بعد دیگرے مر گئے جس سے وہ نیم پاگل سا ہو گیا تھا۔

ایک ڈاکو متواتر عدالت میں آکر مقدمہ کی کارروائی کا پتہ لگاتا رہتا تھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ ملک کی ایسی ناگفتہ بہ حالت کی وجہ مہر خان کا خون ناحق تھا۔ اب اس ڈاکو کو بھی خدا کے قہر اور اس کے عذاب کا احساس ہوا کہ اس قتل وغارت ، مار دھاڑ کی زندگی سے کیا حاصل کیا۔

جب وہ اپنے آپ پر نظر ڈالتا ہے تو ہاتھوں پر خون کے دھبوں اور ضمیر پر بد اعمالیوں کے بوجھ کے سوا کچھ نہیں پاتا تھا۔ دراصل وہ اپنے کئے پر سخت نادم تھا۔ آخر ضمیر کی خلش کے تحت اس نے اس معاملہ پر کئی دن مزید غور وفکر کرنے کے بعد اپنے آپ کو رضا کارانہ نواب آف ٹیری کے سامنے عدالت میں پیش کرکے سنسنی پھیلادی او وہ میڈیکل ڈائریکٹری بھی دے دی جس کے لئے اس ڈاکو نے مذکورہ ملک سے کافی بڑی رقم وصول کی تھی۔ ملک کو خدشہ تھا کہ اس کے خلاف کوئی شہادت نہ نکل آئے ۔ چنانچہ اس نے ان ڈاکوؤں کو بڑی تاکید کی تھی کہ وہ مہر خان کا سب ذاتی سازو سامان ، بستر ، تکیہ وغیرہ اور خاص کر میڈیکل ڈائریکٹری اس کے گھر سے نکال لائیں جس کے عوض میں وہ انہیں کافی روپیہ دے گا۔ لیکن عوضانہ وصول کرنے کے بعد مذکورہ ڈاکو نے ملک کو یہ چکمہ دے رکھا تھا کہ اس نے مہر خان کے بستر وغیرہ کے ساتھ ایک کتاب بھی اٹھالی تھی جو اس کے تکیہ کے نیچے رکھی تھی۔ نیز یہ کہا کہ اس نے اسے نذر آتش کردیا تھا تاکہ وہ کسی اور کے ہاتھ نہ لگ جائے جس سے ملک اور اس کے ساتھیوں کو نقصان اٹھانا پڑے ۔

اس ڈاکو نے عدالت میں اقبال جرم کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ وہ مہر خان کی موت سے بے حد پریشان خاطر ہے۔ چونکہ وہ ایک واجب القتل جرم کا مرتکب تھا جس نے خصوصاً اس کے خاندان کا سکون وچین تباہ کرڈالا تھا اور بذات خود زندہ درگور تھا۔ اس نے عدالت کو یہ بھی کہا کہ " اگر اسے اس جرم کی پاداش میں پھانسی کی سزا دے جائے تو وہ اس سزا کو عدل وانصاف پر مبنی سمجھے گا۔ اس نے اپنے بیان میں یہ بھی کہا کہ اس نے مصمم ارادہ کرلیا ہے کہ آئندہ وہ ایسا گناہ پھر کبھی نہ کرے گا۔ اس نے غارتگری، سفاکی ، لوٹ کھسوٹ کے پیشہ کو مطلق ترک کردیا ہے۔ وہ اب اپنی باقی ماندہ زندگی ، صلح اور امن چین سے گذارنے کا خواہش مند ہے۔"

مقدمہ کی سماعت کے بعد عدالت نے اس ڈاکو کو غالباً وعدہ معاف گواہ ہونے کی بنا پر بری کردیا اور ساتھ ہی سفارش کردی کہ اسے پولیس کا نسٹیبل بھرتی کرلیا جائے۔

استغاثے اور صفائی کے بیانات کی روشنی میں عدالت نے باقی مجرمین کو کالے پانی کی سزا کا حکم سنایا اور انہیں بحرہند کے جزیرہ اینڈمن میں بھیج دیا گیا۔

نوٹ: ان میں صرف ملک اپنی پوری قید کاٹ کر رہا ہوا۔ رہا ہونے کے بعد ٹل شہر میں خوشی خوشی پہنچ گیا۔ ایک دن جب وہ شہر کے بڑے دروازے سے بازار میں داخل ہو رہا تھا کسی دشمن نے جو اس کے قتل کرنے کی گھات میں ایک دیوار کے پیچھے چھپ کر بیٹھا تھا اس کو گولی مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کاش کہ وہ ایسے سنگین جرم کے ارتکاب کرنے سے پیشتر یہ جانتا کہ اس دنیا میں مکافاتِ عمل یعنی جیسی کرنی ویسی بھرنی کا قانون جاری ہے جس سے کوئی متنفس بچ نہیں سکتا۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

نیکی کا بدلہ نیک ہے بد سے بدی کی بات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ سے دے اس ہاتھ لے

باقی تینوں مجرمین بھی قید کے دوران ہی اپنے کئے کا خمیازہ بھگت کر چل بسے۔

جوئیل کی تلاش

سرکاری جدوجہد

کوہاٹ کے ڈپٹی کمشنر کیپٹن فرانسس ہمفری صاحب نے جوئیل کو ڈاکوؤں کے پنجے سے چھڑانے کی جدوجہد بڑے زور سے شروع کردی۔ انہوں نے کئی مخبروں کو بلایا اور انہیں کافی رقم دے کر قبائلی علاقہ میں بھیجا تاکہ وہ جوئیل کا پتہ لگائیں اور کسی طرح اسے بہلا پھسلا کر قبائلیوں کی قید سے نکال لائیں۔ یہ تو پتہ لگ چکا تھا کہ جوئیل کہاں مقید ہے لیکن وہ کسی مخبر کے ہتھے نہ چڑھتا تھا۔ مخبروں نے کئی بار پوشیدگی میں اس سے رابطہ پیدا کرنے کی ہر چند کوشش کی لیکن باہر بار ناکام لوٹ آتے کیونکہ وہ خوف کے مارے ان کے نزدیک نہیں پھٹکتا تھا اسے ہر وقت یہی دھڑکا رہتا کہ وہ بھی ڈاکوہوں گے اور اسے اغوا کرکے لے جائینگے تاہم کیپٹن فرانسس ہمفری صاحب نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔

ڈاکٹر کرمداد خان

اس سلسلہ میں ڈاکٹر مہر خان کا بھتیجا ڈاکٹر کرمداد خان - ایم بی بی ایس جو کسی وقت ٹل مشن ہسپتال کے پہلے ڈاکٹر رہ چکے تھے اور قبائلیوں میں بڑے بارسوخ تھے تن تنہا بڑی دلیری سے ہتھیلی پر جان رکھے ہوئے قبائلی علاقہ میں چل دیئے۔ انہیں قوی امید تھی کہ وہ اپنے اثرورسوخ سے جوئیل کی رہائی میں کامیاب ہوجائینگے۔ وہ دو تین دن خطرناک پہاڑیوں میں بھٹکتے پھرے، وہاں کا چپا چپا چھان کر آخر وہ اس مقام پر جا پہنچے جہاں ڈاکوؤں نے جوئیل کو حراست میں رکھا ہوا تھا۔

قبائلی علاقہ میں یہ حیرت انگیز بات ہے کہ وہاں نہ چوری ہوتی ہے نہ ڈکیتی۔ مہمان نوازی قبائلیوں کے اخلاق کا سنگ بنیاد ہے۔ اگر گاؤں میں کوئی نووارد آجائے تو وہ پورے گاؤں کا مہمان ہوتا ہے۔ وہ کھل کر محبت اور کھل کر نفرت کرتے ہیں اور منافقت ان کی زندگی سے خارج ہے۔

قبائلیوں کے اس رواج کے مطابق ڈاکوؤں کے سردار نے بڑے تپاک کے ساتھ ڈاکٹر کرمداد خان کا استقبال کیا، مہمان رکھا اور ان کی خوب خاطر مدارت کی۔ ڈاکٹر کرمداد خان نے اپنے آنے کا مقصد ظاہر کیا۔ انہوں نے کہا کہ " وہ ڈاکٹر مہر خان کا بھتیجا ہے جسے کچھ دن ہوئے ڈاکوؤں نے قتل کرکے اس کے گھر بار کو تباہ و برباد کردیا اور اس کے چھوٹے بچے جوئیل کو اغوا کرلیا۔ اب وہ بچہ اس وقت آپ کے پاس ہے۔ میں اور چچا ٹل مشن ہسپتال میں ڈاکٹر رہ چکے ہیں۔ ہم دونوں دکھی انسانیت کی خدمت اور قبائلی علاقہ کے بے شمار بیماروں اور زخمیوں کا بغیر کسی نفع یا طمع کے علاج معالجہ کرتے رہے ہیں۔ اس بچہ کی دکھی ماں کی حالتِ زار قابل رحم ہے۔ وہ بچاری نہ صرف بیوہ ہوگئی ہے بلکہ اپنے دلارے بچے سے بھی بچھڑ گئی

ہے۔ اگر اسے بچہ واپس نہ ملا تو وہ اپنا ذہنی توازن بھی کھو بیٹھے گی۔ چنانچہ آپ سے دست بستہ درخواست ہے کہ بچے کو اس کے پاس بھیج دیں۔" انہوں نے بچے کی رہائی کے لئے منہ مانگی قیمت بصورت فدیہ دینے کی بھی پیشکش کی۔ سردار ان کی یہ سب باتیں بڑے غور سے سنتا رہا لیکن جوئیل کو واپس کرنے سے انکار کردیا۔

دراصل سردار نے جوئیل کو اپنا متبنیٰ بنالیا تھا کیونکہ وہ بے اولاد تھا۔ اگر اسے اس سلسلہ میں علم ہوتا کہ جس بچے کو اغوار کرکے وہ لے پالک بنارہا ہے وہ کسی دکھی ماں کی آنکھوں کا نور ہے جس کا دل خون کے آنسو بہارہا ہے اور وہ اپنے لال کی واپسی کے لئے خداوند کریم کے حضور دن رات دعائیں مانگ رہی ہے تو شاید وہ قہر الہیٰ کے خوف سے اسے واپس کرنے پر تیار ہوجاتا۔ لیکن ایسے جرائم پیشہ لوگوں کے دل اکثر پتھر کے ہوتے ہیں اور وہ اپنے مفادات کے لئے دوسروں کے گھروں کو اجاڑنے کی مطلق پروا نہیں کرتے۔

ڈاکٹر کرمداد خان کی خواہش تھی کہ وہ بچے سے مل کر چند لمحوں کے لئے اس سے بات چیت کریں لیکن سردار کے رویہ اور طرزِ گفتار سے وہ بھانپ گئے تھے کہ سردار اس بات پر راضی نہ ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے مزید بات چیت کرنا بے سود سمجھا اور اپنی واپسی کی تیاری شروع کردی۔ سردار نے انہیں اپنے آدمیوں کی نگرانی میں صحیح سلامت ٹل کے بارڈر تک پہنچادیا۔

ڈاکٹر کرمداد خان نے گھر آکر دکھی ماں کو جوئیل کے متعلق سب حال بیان کردیا۔ وہ بار بار ان سے یہی پوچھتی رہیں کہ وہ کیا کرتا ہے، کیسے وقت گزارتا ہے اور صحت کیسی ہے؟ لیکن وہ ان کے سوالوں کا جواب دینے سے قاصر تھے کیونکہ انہوں نے حقیقت میں جوئیل کو دیکھا نہ تھا۔ وہ اپنی من گھڑت باتوں سے دکھی ماں کو ڈھارس دیتے اور اس کی دلجوئی کرتے رہے لیکن وہ جس کی آنکھیں، کان، ذہن اور دل سب شب وروز اپنے کھوئے ہوئے لال میں محو انتظار تھے، ہر آہٹ پر اس کے کان کھڑے ہوجاتے کہ ابھی وہ سامنے آکھڑا ہوگا، لیکن نہ تو اس کا لالوں کا لال آیا اور نہ ہی کرمداد خان اپنی مہم میں کامیاب ہوا۔ دکھی ماں کے چہرے پر صاف صاف یاس کے سائے لرزاں تھے۔ گزشتہ کئی دنوں سے وہ جس امید کے سہارے جی رہی تھی بس خاک میں مل گئی، تو وہ آنسو جو کچھ عرصہ سے رکے ہوئے تھے، طوفان بن کر آنکھوں میں امنڈ آئے۔

زرِ رُستگاری:

قبائلیوں کے ہاں یہ دستور ہے کہ جب وہ کسی شخص کو اغوا کرکے لے جاتے ہیں تو عام طور پر اس کا مقررہ زرِ رستگاری وصول کرن کے بعد اسے رہا کردیتے ہیں۔ عموماً وہ اغوا صرف اپنا پیٹ پالنے کے لئے کرتے ہیں کیونکہ ان کے پاس رزق کمانے کا اور کوئی ذریعہ یا دھندا نہیں ہے۔ جوئیل کے عزیزواقارب کو مخبروں کی زبانی معلوم ہوا کہ قبائلی اس بچے کا زرِ رستگاری پندرہ ہزار روپے مانگتے ہیں۔

جوئیل کی رہائی میں کافی دیر ہورہی تھی جس سے اس کے بھائیوں میں بڑی بے چینی پھیلی ہوئی تھی اور ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوچکا تھا۔ انہوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر اور مقررہ رقم حاصل کرنے کی غرض سے اپنی زرعی اراضی بیچنے کا فیصلہ کرلیا۔ لیکن تقدیر کو یہ بات منظور نہ تھی۔ جب یہ بات کیپٹن فرانسس ہمفری صاحب کے کان تک پہنچی تو انہوں نے ان کو اپنے ہاں بلا کر نہایت ہمدردرانہ انداز میں صبرو تحمل سے کام لینے کی تلقین کی اور انہیں اپنی زرعی اراضی بیچنے کے اقدام سے روک دیا۔

اس زمانہ میں قبائلی عموماً ہندو لوگوں کو اغوا کرنے کےعادی تھی کیونکہ وہ آسانی سے منہ مانگی رقم بصورت زررستگاری ان کے رشتہ داروں سے وصول کرلیا کرتے تھے۔ قتل اور اغوا کی وارداتیں روزمرہ کا معمول تھیں۔ چونکہ جوئیل ایک پہلا مسیحی لڑکا تھا جسے قبائلی اغوا کرکے لے گئے تھے اس لئے کیپٹن فرانسس ہمفری صاحب کو اندیشہ تھا کہ اگر اس کے بھائیوں نے ایک دفعہ قبائلیوں کو اتنا روپیہ بصورت زررستگاری دے دیا تو مستقبل میں یہ نظر مسیحی لوگوں کے لئے وبال جان بن جائے گی۔ اس بات پر جوئیل کے عزیزو اقارب کی امیدیں دم توڑنے

لگیں، اور وہ سخت تذ بزب کا شکار ہوگئے۔ جب وہ اس کی رہائی کا یہ نادر موقع بھی کھو بیٹھے اور ان کی تمام خوش فہیموں پر پانی پھر گیا تو انہوں نے اپنے سینے پر صبر کی سل رکھ لی اور یہ سوچ کر چپ ہوگئے کہ شاید تو کوئی دردمند انسان کے یوسف کو اس اندھے کنویں کی عمیق گہرائی سے باہر نکال ہی لائے گا۔

جوئیل کی رہائی کی مہم میں حکومت افغانستان کی شرکت:

جوئیل کی رہائی میں ایک عرصے تک تمام سرکاری کوششیں اکارت گئیں۔ یوں ہی دن ہفتوں میں بدل گئے اور ہفتے مہینوں میں لیکن اس کی رہائی انتہائی مشکل ہوتی گئی۔ کافی سوچ بچار کے بعد کیپٹن فرانسس ہمفری صاحب کو ایک تجویز سوجھی کہ اگر اسی طرح کی جدوجہد افغانستان کی سرحد کی طرف سے بھی شروع کی جائے تو بہت ممکن ہے کہ قبائلی ڈاکٹر بغیر کسی معاوضہ لینے کے جوئیل کو چھوڑ دینے میں راضی ہوجائیں گے۔ آخر کار ان کی سفارش پر یہ معاملہ صوبہ سرحد کے گورنر نے وائسرے ہند کے گوش گذار کیا تاکہ اگر وہ مناسب سمجھیں تو شاہِ افغانستان سے استدعا کریں کہ وہ اس مسیحی بچے کی رہائی کے لئے امداد کرے۔

چنانچہ اس سلسلہ میں حکومت ہند نے افغانستان کے اعلیٰ حضرت شاہ امیر حبیب اللہ کو اس کارِ خیر میں شرکت کی دعوت دی۔ شاہِ افغانستان نے سارے معاملہ پر نہایت ہی ہمدردانہ طور پر غور کرنے کے بعد حکومت ہند کی استدعا کو قبول کرلیا۔ چنانچہ حکومت افغانستان نے فوراً جوئیل کو ڈاکوؤں سے رہا کرانے کی مہم شروع کردی۔ گو قبائلی علاقہ نہ تو حکومتِ افغانستان کے زیر تحت تھا اور نہ رہی حکومت ہند کے۔ افغان مخبروں نے جوئیل کی تلاش میں اپنی سرحد کے قریب کے قبائلی علاقہ میں چھان پھٹک شروع کردی۔

اللہ کارساز ہے، افغانستان کی سرحد میں اتفاقاً ایک بڑا ظالم وسفاک ڈاکو پکڑا گیا جس نے عرصہ دراز سے قتل وغارت اور ڈاکہ زنی کے متعدد وارداتوں سے لوگوں میں دہشت پھیلا رکھی تھی۔ چونکہ وہ سنگین جرائم کا مرتکب تھا اس لئے سزائے موت کا مستحق تھا۔ افغانستان کے حکام نے اس ڈاکو کو واضح کردیا تھا کہ وہ بد افعال، لاقانونیت، قتل وخون اور ڈکیتی کی وارداتوں کی بنا پر پھانسی کی سزا کے لائق ہے لیکن اگر وہ ایک مسیحی بچے کو جسے قبائلی ڈاکوؤں نے کچھ عرصہ ہوئے اغوا کرلیا تھا، اسے ان کے چنگل سے زندہ چھڑالائے تو وہ معافی کے علاوہ زیادہ سے زیادہ انعام واکرام کا بھی مستحق ہوگا۔ ڈاکو نے افغانستان کے حکام کی یہ شرط بغیر کسی حجت کے منظور کرلی۔

حکومت افغانستان نے اس کو پندرہ ہزار (کابلی) روپے دیئے تاکہ اگر ڈاکوؤں کا سردار جس کی حراست میں یہ بچہ تھا روپے پیسے کا مطالبہ کرے تو یہ رقم اسے دے دی جائے۔

ڈاکو کی ہمت:

چنانچہ حکومتِ افغانستان کے فرمان کے مطابق مذکورہ ڈاکو نے جوئیل کو قبائلی ڈاکوؤں کے چنگل سے چھڑانے کے لئے سر دھڑ کی باز لگادی۔ اس نے اپنے چند مسلح ساتھیوں کی معیت میں قبائلی علاقہ میں جوئیل کی کھوج لگانا شروع کردی۔ وہ کئی دنوں تک ادھر اُدھر بھٹکتے اور لوگوں سے جوئیل کے بارے میں پوچھ گچھ کرتے رہے لیکن جوئیل کا کوئی تسلی بخش سراغ نہ ملا۔ بلآخر اسے اتفاقاً ایک پرانا دوست مل گیا جو اس کا ہم پیشہ تھا اور اس سے اسے معلوم ہوا کہ جوئیل فلاں سردار کے ہاں زیر حراست ہے۔ اس خبر سے اس کے دم توڑتے ہوئے حوصولوں کو سہارا مل گیا۔ اس نے قبائلیوں کے مذکورہ سردار سے رابطہ پیدا کیا اور اس کو صاف صاف کہا کہ وہ حکومتِ افغانستان کے حکم سے اس بچے کی تلاش میں بھیجا گیا ہے تاکہ اسے رہا کراکے شاہِ افغانستان کے سامنے حاضر کرے۔ سووہ اس بچے کو اس کے سپرد کردے اور اس کے معاوضہ میں پندرہ ہزار کابلی روپے وصول کرلے۔ قبائلیوں کا سردار یہ سب باتیں سن کر ہکا بکا ہوگیا۔ وہ حیران تھا کہ اس معاملہ میں حکومتِ افغانستان اس قدر دلچسپی کیوں لے رہی ہے۔ وہ اس بچے کو مذکورہ ڈاکو کے حوالے کرنے میں قطعاً رضامند نہ تھا۔ کچھ دیر وہ اپنے چند جگری دوستوں کے ساتھ اس معاملہ پر کھسر پھسر کرتا رہا۔

آخر کار اس نے یہ معاملہ اپنے قبیلہ کی مجلس میں فیصل کرنے کے لئے پیش کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قبائلیوں کی نصف پارٹی تو روپے وصول کرنے کے حق میں ہو گئی اور نصف پارٹی اس کے خلاف تھی۔ ان متضاد خیالات کے باعث اس قبائلی گروہ میں خون خرابے کا خدشہ پیدا ہو گیا۔ آخر کار سردار کو یہ سوجھی کہ چونکہ اس بچے کی وجہ سے سارے گروہ میں نفاق پیدا ہو گیا ہے اس لئے اس نفاق کو دور کرنے کے لئے یہی بہتر ہے کہ اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔" نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔"

دل ہی دل میں فیصلہ کرکے سردار اپنے خیمے کی طرف بڑھا اور پستول نکال لایا، اس کا رخ فوراً جوئیل کی طرف کرکے جو اس وقت کچھ دور بیٹھا سب باتیں سن رہا تھا گولی چلادی لیکن نشانہ خطا گیا۔ جوئیل سردار کی حرکت سے سہم گیا لیکن وہ کرتا بھی کیا۔ قربانی کے بکرے کی طرح وہ ان کے درمیان بے بس اور بے کس تھا۔ خوف سے اس کی زبان بند ہو گئی اور وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ سرحدی ڈاکو سردار کی سب باتوں کو تاڑ گیا کہ سردار نے اس بارے میں گفت وشنید کے سارے راستے بند کردیئے ہیں اور اس سے قبل کو وہ بچے کا کام تمام کرتا اس نے چشم زون میں بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اپنے بھرے ہوئے پستول سے سردار پر گولی چلادی جو اس کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ گروہ میں افراتفری پڑ گئی اس گڑ بڑ میں ڈاکو نے بچے کو پکڑلیا۔ جوئیل بہت مچلا اور چیخا، مگر ڈاکو نے اسے مضبوطی سے پکڑ کر اپنے گھوڑے پر سوار کیا اور سرپٹ دوڑاتا ہوا سرحد پار گیا۔ اعلیٰ حضرت فرمانروائے افغانستان شاہ امیر حبیب اللہ خان جوئیل کو جیتا جاگتا دیکھ کر نہایت خوش ہوئے۔

جوئیل کی آپ بیتی

جوئیل قبائلیوں کے ہاں قریباً چھ مہینہ مقید رہا۔ اسے قید کے دوران ہر روز زدوکوب کی جاتی تھی تاکہ وہ زرِ مخلصی اپنے عزیزوں سے منگوائے، لیکن وہ ایسا کرنے سے قاصر تھا کیونکہ وہ ناخواندہ تھا۔ اس کو سوکھی روٹی کھانے کو دی جاتی تھی۔ اس کو پتھروں پر سونا پڑتا تھا۔ اگر وہ اپنے ناقص کھانے کے بارے میں ان سے شکایت یا اصرار کرتا تھا تو وہ اسے بیدردی سے لاتوں اور گھونسوں سے مارتے تھے۔ کچھ عرصہ تک اسے لوہے کی بھاری زنجیروں سے بھی باندھا گیا تھا تاکہ وہ فرار ہوسکے۔ علی الصباح اس کو گاؤں سے باہر لے جاکر حراست میں رکھا جاتا اور شام ہوتے ہی واپس لایا جاتا تھا تاکہ اس کا کوئی سراغ نہ لگا سکے۔ وہ اس تلخ زندگی سے بیزار ہو گیا تھا اور اکثر رات کو اپنی بد نصیبی اور بے بسی پر آنسو بہاتا رہتا تھا۔

قبائلیوں نے گرم گرم لوہے کی سلاخوں سے اس کی رانوں کو داغ رکھا تھا تاکہ وہ فرار نہ ہوسکے۔ اس لئے حکومت افغانستان نے اسے ایک ماہ کے عرصہ تک اپنے ہاں روک لیا تاکہ اس کے زخم جو ابھی تازہ تھے بھر جائیں۔ حکومت نے اس کے زخموں کا بہتر اور بڑا مہنگا علاج تجویز کیا جسے قبائلی " بکرے کی کھال چڑھانا" کہتے ہیں۔ پہلے ایک بکرے کو حلال کیا گیا اور گرم گرم اس کی کھال اتارلی گئی اور جوئیل کی ٹانگوں پر چڑھادی گئی۔ چند ایام کے بعد یہ زخم کھال کے نیچے خود بخود مندمل ہو گئے۔ اس کے بعد حکومت افغانستان نے جوئیل کو کچھ نئے کپڑے اور نقدی دے کر خوست کے گورنر کے پاس بھیج دیا۔ خوس افغانستان کا ایک صوبہ تھا جس کا گورنر ہندو تھا۔ یہاں بھی اسے کچھ عرصہ کے لئے رکھا گیا۔

ماں کو کھویا ہوا بیٹا مل گیا

بلاآخر بچے کی ماں کو غالباً ستمبر ۱۹۱۵ء کے ایک دن ڈپٹی کمشنر بنوں کی معرفت مطلع کیا گیا کہ وہ اسے خوس سے لے جانے کا بندوبست کریں۔ اس خوشخبری سے اس کی ماں اور بہن بھائیوں کے چہرے دمک اٹھے اور ان سب کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ خصوصاً ماں کے چہرے سے تو شفقت کے سوتے ابلے پڑتے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر مسز پینل صاحبہ جو ایک نہایت حسین وجمیل پارسی مسیحی خاتون تھیں۔ اپنی موٹر میں خوست کی سرحد پر گئیں اور وہاں سے جوئیل کو بنوں لے آئیں۔ اُدھر دُکھی ماں، بہن بھائی سب اس کے انتظار میں دیدہ ودل فرشِ راہ کئے کھڑے تھے۔ اس وقت اس کی حالت یہ تھی کہ اس نے ملیشیا کا لمبا کرتا اور

بھاری گھیر کی شلوار پہن رکھی تھی۔ جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا تھا اور گال اندر کو پچکے ہوئے تھے۔اس کی آنکھوں سے وحشت اور ویرانی ٹپکتی تھی۔ مناسب خوراک نہ ملنے کے باعث اس کا پھول سا چہرہ زرد ہو گیا تھا جیسے کسی نے اس کے جسم سے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ وہ تلی کے مرض میں مبتلا تھا اور پہاڑوں اور نوکیلے پتھروں پر ننگے پاؤں چلنے سے اس کے تلوے پھٹ چکے تھے۔ اس کے زرد چہرہ پر ان سنگدل انسانوں کے ظلم و تشدد کی داستان رقم تھی۔ دکھیاری ماں نے آنسوؤں کی جھڑی لگائے ہوئے جس سے اس کا گلا رندھ گیا تھا اپنے بچھڑے ہوئے لال کو اپنی بانہوں میں لے کر کلیجے سے لگالیا اور دیوانہ وار پیار کرنا شروع کر دیا۔ پھر فرطِ محبت سے بے قابو ہو کر اسے اپنے جسم کے ساتھ لپیٹ لیا اور دیر تک اس سے لپٹی رہی۔ اسے دیکھ کر بہن بھائیوں کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اس کی بڑی بہن ایلس اس کے گلے سے لپیٹ کر دیر تک روتی رہی، اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی تھیں۔ یہ منظر اتنا درد ناک تھا کہ متعدد افراد جو جوئیل کو ملنے کی خاطر آئے تھے اشکبار تھے۔ جوئیل نے ادھر ادھر دیکھ کر اپنی امی سے معصومانہ انداز میں سوال کیا ابا جان کہاں ہیں امی جی ؟ وہ مجھے لینے کیوں نہیں آئے ؟ اس پیکر شفقت نے یہ سمجھ کر کہ کہیں اس کے ننھے دل کو ٹھیس نہ لگے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہ اس کی تلاش میں قبائلی علاقہ میں گئے ہوئے ہیں جلد واپس آجائیں گے۔ اس وقت وہ اس طرح ہانپ رہی تھیں جیسے طویل سیڑھیاں چڑھ کر آئی ہوں۔ ان کے دل میں ایک غم کا سمندر موجزن تھا۔ انہوں نے شفقتوں سے لدا ہوا ہاتھ جوئیل کے سر پر رکھا اور بولتے بولتے اسی طرح خاموش ہو گئیں۔ اب ابا جان کی واپسی کے انتظار میں گھڑیاں گننا جوئیل کا معمول تھا لیکن وہ نہ آئے۔ آخر کار اس بارے میں اس کی شب و روز کی اضطرابی دور کرنے کی خاطر ایک دن اس کی امی کو سب راز افشا کر دینا پڑا۔ یہ سنتے ہی وہ ہکا بکا رہ گیا۔ کیونکہ اب وہ اپنے ابا جان کی شفقت، محبت اور نگرانی سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا تھا۔ قبائلی طرز زندگی نے جوئیل کو چڑچڑا اور بد مزاج بنا دیا تھا۔ کبھی کبھار وہ معمولی سے بات پر بگڑ بیٹھتا تھا اور گھر سے فرار ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ یہی ڈراوا دیتا تھا کہ وہ اپنی قبائلی ماں کے پاس چلا جائے گا جو اسے بہت پیار کرتی تھی۔ کافی عرصہ تک اسے قبائلی ماں کی محبت ستاتی رہی۔ دراصل قید کے دوران ذہنی طور پر وہ اس قبائلی ماں کو جس کا نام "خونی" تھا اپنی ماں کا نعم البدل سمجھنے لگا تھا۔ وہ اپنا گھر بھی بھولتا جا رہا تھا، ماں باپ کی یاد بھی دھندلا چکی تھی۔ خونی، ماں کی طرح اس سے محبت کرتی تھی۔ جو کچھ اس کے بس میں تھا وہ اسے چوری چھپے کھلاتی پلاتی رہتی تھی۔ کبھی کبھار وہ نیم غنودگی میں رات کو اپنی قبائلی ماں کو پکارتا اور رونے لگ جاتا تھا۔

ایک دن جوئیل نے ڈاکٹر مسز پینل صاحبہ کو بتایا کہ اس کے قبائلی ماں باپ روزہ اور نماز کے بڑے پابند تھے۔

مسز پینل صاحبہ نے جوئیل سے سوال کیا کہ جب وہ نماز پڑھتے تھے تو تم کیا کیا کرتے تھے؟

جوئیل نے معصومانہ انداز میں جواب دیا کہ میں بھی دعا کیا کرتا تھا اور وہ دعا یہ تھی۔:

" اے ہمارے باپ، تو جو آسمان میں ہے، تیرا نام پاک مانا جائے، تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے، زمین پر بھی ہو۔ ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے اور ہمارے قصوروں کو معاف کر کہ ہم بھی اپنے قصورواروں کو معاف کرتے ہیں اور ہمیں آزمائش میں نہ پڑے دے بلکہ برائی سے بچا۔ کیونکہ بادشاہی اور قدرت اور جلال ابد تک تیرا ہی ہے۔ آمین۔"

جوئیل کے والد مرحوم کی زندہ روح کو بھی یہ سن کر بڑی مسرت ہوئی ہو گی۔ مسز پینل صاحبہ کو اس کے ترت پھرت جواب سے بڑی خوشی ہوئی۔ یقیناً۔

اظہارِ تشکر

ڈاکٹر مہر خان کے قاتلوں کی گرفتاری اور جوئیل کو قبائلی ڈاکوؤں کے چنگل سے رہائی میں کیپٹن فرانسس ہمفری صاحب سابق ڈپٹی کمشنر کوہاٹ نے جس بے پناہ صبر و تحمل سے جدوجہد کی وہ قابلِ تعریف تھی۔ اس کامیابی کا سہرا ہمفری صاحب کے سر تھا۔ اس کے

بعد اب تک سارے شمال مغربی سرحدی علاقہ میں کبھی بھی کسی مسیحی فرد (بالغ یا نا بالغ) کے اغوا کی ورادت سننے میں نہیں آئی تھی۔ یہ سب اسی ذی اختیار افسر کی دور اندیشی کا نتیجہ ہے کہ اس نے جوئیل کے عزیزو اقارب کو قبائلی ڈاکوؤں کو زر مخلصی دینے سے روک دیا تھا۔ علاوہ ازیں جوئیل کی رہائی کے سلسلہ میں بنوں مشن کے فرشتہ صفت اصحاب نے دن کو دن اور رات کو رات نہ سمجھا اور بے اندازہ امداد دی۔ ڈاکٹر مہر خان کی اولاد ان کے اس عظیم احسان کو زندگی بھر فراموش نہیں کرسکتی۔

یہاں ایک اور بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس سارے دردناک واقعہ کی تفصیل ڈاکٹر مسز پینل صاحبہ نے اپنے ایک خاص ماہانہ رسالہ میں قلمبند کرنی شروع کردی جس کی اشاعت لندن سے ہوتی تھی۔ اس میں ڈاکٹر مہر خان کی شہادت کا حال اور جوئیل کی تلاش اور اس کی رہائی کے سلسلہ میں جو جدوجہد کی جارہی تھی ان کی تفصیلات وقتاً فوقتاً اس رسالہ میں شائع ہوتی رہیں۔ قریباً اس موضوع پر دس قسطیں شائع ہوئیں۔ یہ رسائل ڈاکٹر مہر خان کے خاندان کے پاس تھے۔ لیکن چونکہ یہ نہایت ہی دلچسپ تھے اس لئے جس نے ان کو پڑھنے کے لئے لیا پھر واپس نہ کیا اور نہ ہی ڈاکٹر مہر خان کی اولاد نے ان کی واپسی کے بارے میں کوشش کی۔ ان رسائل کے پڑھنے سے ولایت کا ایک بڑا تاجر اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے ریورینڈ وگرم صاحب (بنوں) کو ایک مکتوب بھیجا جس میں اس نے کہا کہ اگر ڈاکٹر مہر خان کی اہلیہ کو اعتراض نہ ہو تو میں جوئیل کو لے پالک کرلینے کا خواہش مند ہوں، اور اس کو ولایت میں تعلیم دینے اور اس کے تمام خرچ اخراجات کا ذمہ لیتا ہوں۔ لیکن وہ دکھیاری اور مامتا کی ماری اپنے لال سے جدائی کسی حالت میں قبول کرنے کو تیار نہ تھیں۔ اس لئے وہ اس فیاض تاجر کی پیش کیش کو منظور نہ کرسکیں۔ بہر حال انہوں نے وگرم صاحب کی معرفت اس تاجر کی فیاضی کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا۔

بنوں کی کلیسیا کا مرحوم کو خراجِ عقیدت

بنوں کی کلیسیا (جماعت) کو ڈاکٹر مہر خان کے ظالمانہ قتل کا دلی صدمہ ہوا۔ یہ المناک واقعہ ان کے لئے دلگذار بھی تھا اور ایمان افروز بھی۔ ان کی مسیحی خدمت اور شہادت کے پیش نظر کلیسیا نے ۱۹۱۵ء میں ایک سنگ مرمر کی تختی ان کی دائمی یادگار میں بنوں کے انگلیکن گرجا گھر میں نصب کی ہے۔ تختی پر عبارت انگریزی زبان میں کندہ کی گئی ہے جس کا ترجمہ کچھ یوں ہے۔

" بیادگار احترام جناب ڈاکٹر مہر خان، ساکن شیخ محمود جو لارڈ رابرٹس ہسپتال ٹل کے انچارج تھے اور اپنی ملازمت کے دوران مذہبی جنونیوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔"

۱۲ مارچ ۱۹۱۵ء

"جان دینے تک بھی وفادار رہ تو میں تجھے زندگی کا تاج دوں گا۔"

پشاور میں مرحوم کی یاد میں چراغ جلانا

مشن ہسپتال پشاور کے بُرج چیپل میں معزز مرحوم ڈاکٹر مہر خان شہید کی یادگاری میں ہر سال چراغاں کیا جاتا اور بزرگ پادری سمسون خان نیازی (مرحوم) جو کبھی انگلیکن گرجا کے پاسبان تھے بڑے احترام اور عقید تمند ی سے مرحوم کی زند گی کی واقعات سنایا کرتے اور کلیسیا کو ایک سچے غیور پٹھان مسیحی کی ارفع واعلیٰ زند گی سے متعارف کیا کرتے تھے۔ پشاور کی کلیسیا میں مسیحی شہدا کی یاد میں مشن ہسپتال کے بُرج چیپل میں سالانہ چراغ روشن کرنے کی رسم کئی برسوں تک ادا کی جاتی رہی ہے۔ یرمیاہ خان کو غالباً ۱۹۶۰ء میں مرحوم ڈاکٹر جوزف پال صاحب سے جو کبھی پشاور مشن ہسپتال کے میڈیکل سپر ٹنڈ نٹ تھے زبانی معلوم ہوا کہ یہ رسم باقاعدہ ہر سال بڑے جوش سے ادا کی جاتی ہے۔

کتابیات

۱۔چرچ مشنری سوسائٹی کی افغان مشن بنوں کی انگریزی رپورٹ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۶ء شمال مغربی سرحدی صوبہ صفحات ۳اور ۴۔

۲۔ڈاکٹر مسز ایلس ، ایم پینل کی انگریزی کتاب " پینل آف دی افغان فرنٹیر " (افغان سرحد والا پینل) (۱۹۱۴ء) صفحات ۷۵-۷۶

۳۔ڈاکٹر ٹی۔ ایل پینل کی انگریزی کتاب " امنگ دی وائلڈ ٹرائبز آف دی افغان فرنٹیر۔" (افغان سرحد کے بے قابو قبائل کے درمیان) (۱۹۰۸ء) باب اول اور صفحات ۳۰۹-۳۱۰

۴۔مکتوب از چرچ مشنری سوسائٹی (لندن) ۱۶ ستمبر ۱۹۵۹ء بنام یرمیاہ خان (لاہور)

۵۔ مکتوب از ریورنڈ ایم ۔ای ۔ وگرم صاحب (کوہاٹ) بنام چرچ مشنری سوسائٹی لندن (۱۳مارچ ۱۹۱۵ء)

۶۔مکتوب از ڈاکٹر آر، جے ایچ کاکس صاحب (لندن) ۲ اگست ۱۹۱۵ء) بنام چرچ مشنری سوسائٹی (لندن) جو سوسائٹی کے رسالہ " گلیز" میں شائع ہوا۔

۷۔مکتوب از ڈاکٹر آر ۔ جے ۔ ایچ ۔ کاکس صاحب (لندن) ۲۳ اکتوبر ۱۹۶۷ء بنام جناب این ۔ سی ۔ شریک صاحب نگران سینٹ اگستن چرچ، کوہاٹ۔